مختلف اصنافِ تحریر پر مشتمل دل چسپ مضامین کا مجموعہ

کلیاں

مصنّف

محمد سعد رفیق گاڈت

فاضل و متخصص فی الفقہ

جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی

IlmoAmal

SKYRISE
PUBLICATIONS

مُختلف اصنافِ تحریر پر مشتمل دلچسپ مضامین کا مجموعہ

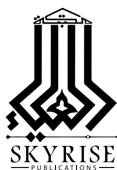


مُصنِّف

محمد سعد رفیق گاڈت

فاضل و مُتخصّص فی الفقہ

جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی





نام کتاب: کلیات
مُصنِّف: محمد سعد رفیق گاڈت
باہتمام: محمد سعد
طباعت اول: دسمبر ۲۰۲۲ء، جمادی الاولیٰ ۱۴۴۴ھ
تعداد: ۱۰۰۰

ناشر

مکتبۃ العَلیاء / SKYRISE PUBLICATIONS





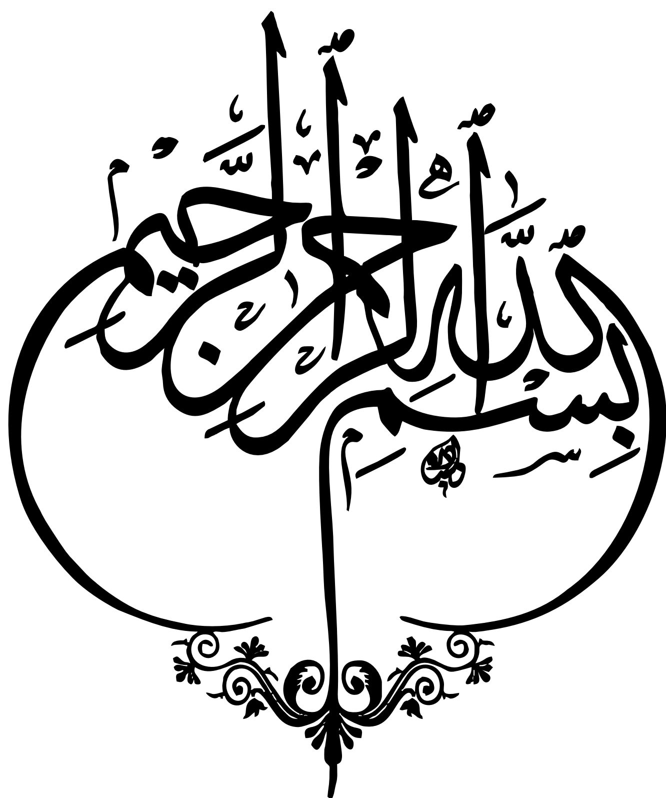
ملنے کے پتے:

گھر بیٹھے کتاب حاصل کرنے کے لیے یا بڑی تعداد میں کتاب حاصل کرنے کے لیے مکتبۃ العَلیاء کے آفیشل نمبر پر فون یا واٹس ایپ کے ذریعے رابطہ کریں:

+92 331 687 4401

اس کے علاوہ یہ کتاب مذکورہ کتب خانوں پہ بھی دست یاب ہے:

- زمزم پبلشرز کراچی رابطہ نمبر: +92 335 1111329
- مکتبہ فہم دین، ڈیفنس فیز ۴، کراچی
- اسلامی کتب خانہ جمشید روڈ کراچی


بسم الله الرحمن الرحيم

قَالَ النَّبِیُّ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم:

« تَہَادَوْا تَحَابُّوْا »

(الادب المفرد للبخاري)

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے:

”تم ایک دوسرے کو ہدیہ دیا کرو، آپس میں محبت بڑھے گی۔“

علم خدا کی روشنی ہے، ہم اس روشنی کو آپ تک پہنچانے کے لیے کوشاں ہیں، آیئے اس روشنی کو دوسروں تک پہنچانے میں ہمارے ساتھ تعاون کیجیے، کیوں کہ روشنی ہے سب کا حق، شکریہ۔

انتساب



وہ ذات جس کی بدولت قلم میں روشنائی ہے اور عالم کے ہر ذرے کا وجود اُسی کا محتاج ہے اور اُسی کی طرف لوٹتا ہے، جس کے ہر بول پر علم و بصیرت کے بے انتہا نکات پوشیدہ ہیں اور جو درگزر کرنے والا اور اِستحقاق کے بغیر خوب عطا کرنے والا ہے، اسی کے کرم کا محتاج، اسی کی عطا کا طلب گار، اسی کی رضا پر سرشار اور مر مٹنے کے لیے تیار یہ بندہ اپنا یہ بیاض اس کی نظر کرتا ہے۔

اور

اس عظیم ہستی کے نام جو وجہ کائنات ہے، محبوب الخلائق ہے، سید الکونین والثقلین ہے، جس کا نام لیتے ہیں تو منہ خود ہی میٹھا ہو جاتا ہے اور جس کے نام لینے میں ہونٹ دو مرتبہ اپنا بوسہ لے لیتے ہیں۔ ہم تو جی ہی ان دو کریموں اور دو حبیبوں کے درمیان اور اُن کے احسانات تلے رہے ہیں۔

یا رب! تو کریمی و رسولِ تو کریم
صد شکر کہ ہستیم میانِ دو کریم



شمس الرحمٰن العباسی

سولجر بازار نمبر 2، گارڈن ایسٹ، مالک جی اسٹریٹ، کراچی پاکستان۔ فون: 021-2228521

حوالہ نمبر ________



تاریخ 20/10/202

باسمہ الرحمٰن

بندہ مدارا اپنے محبوب مرید اور خاص تعلق رکھنے والے اور دین کیلئے
بڑی جد و جہد قربانی اور لمبا سفر طے کرنیوالے بیٹا محمد سعد رفیق کی کتاب
کا پرذوق اور پرشوق مطالعہ جبین کا مجموعہ کلیات اول تا آخر
مطالعہ کیا اور شروع کرتے ہی اسمیں ایسا مستغرق ہوا کہ
جبتک ختم نہیں کیا نہیں چھوڑا بہت باذوق
اور علم و عمل اور محنت و مطالعہ کا شوق پیدا کرنیوالا
مفید رسالہ پایا دل و دماغ کو سکون دینے والا ہمت بڑھانے
کرنیوالا یا اللہ انکی اس محنت کو قبول فرمادیں
اور قارئین کیلئے علم و عمل میں بڑھنے کا ذریعہ بنادے
اور انکے لئے ہمارے لئے صدقہ جاریہ بنادے اور اپنے
دربار عالیہ میں مقبول بنادے

بندہ شمس الرحمٰن العباسی
مسجد غفوری سولجر بازار کراچی
بروز الخمیس بعد الظہر

تقریظ

پیرِ طریقت حضرت جی شیخ المشائخ شمس العارفین مولانا شمس الرحمن عباسی دامت برکاتہم العالیہ

امام وخطیب جامع مسجد غفوری

جانشین خانقاہِ غفوریہ حقانیہ نقشبندیہ سلسلۂ عالیہ نقشبندیہ مجددیہ غفوریہ حقانیہ

باسمہ الرحمن

بندہ نے اپنے محبوب مرید اور خاص تعلق رکھنے والے اور دین کے لیے بڑی قربانی اور لمبا سفر طے کرنے والے پیارے بیٹے محمد سعد رفیق گاڈت کا پُر ذوق اور پُر شوق مضامین کا مجموعہ کلیاں از اول تا آخر مطالعہ کیا اور شروع کرتے ہی اس میں ایسا مستغرق ہوا کہ جب تک ختم نہیں کیا نہیں چھوڑا۔

بہت باذوق اور علم وعمل اور محنت ومطالعے کا شوق پیدا کرنے والا مفید رسالہ پایا۔ دل ودماغ کوسکون دینے والا، ہمت بڑھانے والا پایا۔

اللہ پاک ان کی اس محنت کو قبول فرمائیں اور قارئین کے لیے علم وعمل میں بڑھنے کا ذریعہ بنائے۔ اور اسے ان کے اور ہمارے لیے صدقۂ جاریہ بنائے اور اپنے دربار عالیہ میں مقبول بنائے۔ آمین۔

بندہ شمس الرحمن العباسی

مسجد غفوری سولجر بازار کراچی

یوم الخمیس بعد الظهر في غرفتي



فہرست

صفحہ نمبر	عنوانات	نمبر شمار
10	ابتدائیہ	1
12	تقریظ	2
14	میں بھی ایک لکھاری ہوں!	3
16	مطالعہ ومشاہدہ	4
20	ہم نشین ودل ربا، مطالعہ	5
24	سوچ پر منحصر کلام تیرا	6
27	میڈیا کی یلغار: توپ یا تلوار!	7
31	مطالعہ ومشاہدہ: زیرو پوائنٹ	8
33	اناڑی سے لکھاری تک کا سفر	9
35	تمنائے دل	10
39	ہماری جیت	11
45	انسان ان مول ہے	12
51	بڑا دِل	13
56	آج کی کہانی	14

صفحہ نمبر	عنوانات	نمبر شمار
59	انٹرویو بہاروں کی برسات کا	15
63	خامیوں سے خوبیوں تک	16
66	تین بہن بھائی اور لاک ڈاؤن کے دن	17
73	بدل دو جہاں کو	18
79	مضبوط رشتے	19
80	راہِ ہجرت	20
92	یہ چمن ہمیشہ آسودہ حال رہے گا	21
94	جو ہر پل میرے روبرو ہے	22
99	مستقبل کی تصویر: (Vision)	23
104	قلندریت	24
119	استادِ محترم رحمۃ اللہ علیہ	25
139	میرے مرشد و مربی	26
142	حجت، ماہرین فن کا قول ہے	27
144	مغرب اور اُس کی دوغلی سیاست	28
147	مرشدي ومولاي شمس الرحمٰن العباسي رحمۃ اللہ علیہ	29
150	سيرة الرسول الخاتم صلی اللہ علیہ وسلم	30
154	Junaid Jamshed - Our Beloved	31
159	Oh, Abdullah! Be Allah's!	32

ماں جی!

ماں جی کی پیدائش ۵ جمادی الاولی ۱۳۸۰ھ، مطابق ۲۶، اکتوبر ۱۹۶۰ء کو کراچی شہر میں ہوئی۔ ان کے والدین ہندوستان سے ہجرت کر کے پاکستان آئے تھے۔ والد ایک تاجر اور سماجی خدمت گزار شخص کی حیثیت سے معروف تھے اور برادری میں ایک نام وَر اور عزت دار شخص سمجھے جاتے تھے۔

ماں جی اپنی تین بہنوں میں دوسرے نمبر پر تھیں، ان کے تین بھائی بھی ہیں، جن میں سب ماشاءاللہ! اچھے اور با اخلاق ہیں۔ ماں جی کے ابو اور اَمی بھی الحمدللہ! بقید حیات ہیں۔

میں اس سے قیمتی شے کوئی کھو نہیں سکتا
عدیلؔ! ماں کی جگہ کوئی ہو نہیں سکتا

ان کی ہم سے جدائی:

۴ جمادی الثانی ۱۴۴۴ھ، مطابق ۷ ۲ دسمبر ۲۰۲۲ء، بدھ کی رات کو ہوئی۔ ان کی جدائی پر طبعی غم تو ضرور ہے لیکن اللہ پاک سے بڑی امیدیں بھی ہیں۔ جتنا ہم ان کے لیے اچھے تھے اللہ پاک اس سے زیادہ ان کے لیے اچھے ہیں۔ اسی طرح جتنا وہ ہمارے لیے اچھی تھیں، اللہ رب العزت ان سے زیادہ ہمارے لیے اچھے ہیں۔ جتنی ہم ان سے محبت کرتے ہیں رب العالمین کی ان سے محبت کئی گنا زیادہ ہے اور جس جگہ وہ گئی ہیں، وہ جگہ بھی اس جگہ سے کئی گنا بہتر ہے۔

چلتی پھرتی ہوئی آنکھوں سے اذاں دیکھی ہے
میں نے جنت تو نہیں دیکھی ہے، ماں دیکھی ہے

ننھیال میں سب سے پہلے میری والدہ رخصت ہوئیں اور شان سے ہوئیں۔ کینسر کے مرض میں تھیں اور متعدد بیماریوں کا شکار تھیں، تکلیف میں تو تھیں، لیکن دنیا کی قید سے نکل کر ہر تکلیف سے آزاد ہو گئیں اور جنت کی کشادگی کی طرف روانہ ہو گئیں۔

جنازہ بھی ہمارے شیخ حضرت جی مولانا شمس الرحمان عباسی صاحب نے پڑھایا۔ متعدد علما و طلبہ بھی جنازے میں شریک ہوئے۔ سنا ہے کہ کینسر بزرگوں کی بیماری ہے۔ حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ، ان کے متعدد خلفاء اور مولانا عبدالغفور مدنی عباسی رحمۃ اللہ علیہ جیسے بڑے بزرگوں کو اللہ پاک نے یہ بیماری دے کر اپنے پاس بلایا۔

پھر موذی مرض میں انتقال بھی شہادت ہے۔ یوں اللہ پاک نے انھیں شہادت عطا کی۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''شہید پانچ ہیں: طاعون کی بیماری سے مرنے والا، پیٹ کی بیماری سے مرنے والا، ڈوب کر مرنے والا، دب کر مرنے والا اور اللہ کی راہ میں شہید ہونے والا۔'' (متفق علیہ)

یہ ہی نہیں، بل کہ مسکراتے ہوئے کلمہ پڑھتے ہوئے گھر ہی سے رخصت ہوئیں اور جسے مرتے وقت کلمہ نصیب ہو جائے کس شان سے وہ رخصت ہوتا ہے! ہم تمام عمر یہی دعا کرتے ہوئے گزارتے ہیں کہ اے اللہ! مرتے وقت کلمہ نصیب فرمانا اور جو اللہ کے چنیدہ بندے ہوتے ہیں انھیں کلمہ نصیب بھی ہو جاتا ہے۔

والدہ محترمہ ہر وقت اولاد کا سوچتیں اور اُن کے لیے خیر چاہتیں۔ نماز روزے کی پابند تھیں اور ایک بے ضرر خاتون تھیں۔ اسی طرز پر اُنھوں نے زندگی کے باسٹھ سال پورے کیے۔

والدہ کا ایک اچھے گھرانے سے تعلق تھا۔ بہت فیاض رہیں۔ جب میں نے ادارہ علم و عمل کی بنیاد رکھی تو اولین تعاون والدہ ہی کا رہا اور تا حال جاری تھا۔ جب پہلی کتاب کی طباعت کی ضرورت پیش آئی تو بھی والدہ نے ساتھ دیا۔ اس کے علاوہ بھی بہت سی صورتیں صدقۂ جاریہ کی چھوڑ کر

رخصت ہوئیں۔ مجھے بچپن سے ملے ہوئے تحفے تحائف (جو نقود وغیرہ کی صورت میں تھے) با قاعدہ حساب کے ساتھ محفوظ رکھے اور بڑے ہوجانے کے بعد میرے سپرد کیے۔ معاملات کی بھی پکی تھیں۔

الحمدللہ! اللہ پاک نے انھیں چار فرماں بردار اور خدمات گزار بیٹیوں اور دامادوں سے نوازا اور آخر میں میری صورت میں ایک بیٹا دیا۔

میں ان کا اکلوتا بیٹا اور گھر میں بھی اکیلا تھا۔ بہنیں سب پہلے ہی رخصت ہوچکی تھیں، اس لیے اب ان کی زندگی میرے ہی گرد اور میری ہی خدمت میں گزرتی۔ خاص طور پر مجھے فجر سے پہلے ناشتا دینا، مغرب کے بعد کھانا اور گرم روٹی بنانا، پھر میری تہجد کی ''پارٹنر'' بھی تھیں، کبھی میں انھیں اور کبھی وہ مجھے جگاتی تھیں۔ میرے خوب ناز اُٹھاتیں اور محبتوں ہی سے نوازتی رہیں۔ میرے والد محترم بھی ہمیشہ ان سے خوش رہے۔ ان کی بھی مکمل دیکھ بھال کرتی رہیں۔ ابو جان بھی زندگی میں کافی بیماریوں کا شکار ہوئے۔ والدہ آخر تک ان کی خدمت کرتی رہیں اور اِس میں کوئی کمی نہیں آنے دی۔

جب تک ماتھا چوم کے رخصت کرنے والی زندہ تھی
دروازے کے باہر تک بھی منہ میں لقمہ ہوتا تھا

شام ڈھلے اک ویرانی سی ساتھ مرے گھر جاتی ہے
مجھ سے پوچھو اُس کی حالت جس کی ماں مرجاتی ہے

اللہ کریم سے دعا ہے کہ اپنے شایان انھیں بدلہ عطا کرے۔ انسان ہونے کی خاطر جو لغزشیں ہوئیں ہوں، ان سے درگزر فرمائے اور ہمیں ان کے لیے صدقۂ جاریہ بننے کی توفیق نصیب فرمائے۔ آمین، ثم آمین

ابتدائیہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمد اللہ تعالیٰ و نشکرہ علی مننہ العظیم و نصلی علی الرسول المجتبی

و علی آلہ و أصحابہ الأتقیاء، أما بعد!

کرونا کا دور ایک عجیب دور گزرا تھا۔ گھر میں بند، نمازیں بھی گھر میں، کوئی مٹرگشت نہ کوئی بیرونی سیر و تفریح۔ اس دور کے متعلق زیادہ لکھنے کا دِل تو نہیں، مگر جو اِس دور میں لکھا اسے پیش کرنے کی آرزو ضرور ہے۔ الحمدللہ! احقر فجر کے بعد سونے کا عادی نہیں ہے، اس سے انسان کی زندگی میں بہت برکت ہوتی ہے اور وہ نہ چاہتے ہوئے بھی بہت سے کام کرگزرتا ہے۔ خاص کر جب انسان گھر میں بند ہو اور کہیں باہر نکلنے کی سبیل بھی نہ ہو۔

شخصی تعمیر کے حوالے سے بہت سے ارمان دل میں گردش کرتے تھے، جنھیں پورا کرنے کا خوب موقع کرونا کے دور میں ملا۔ مطالعے اور وقت کی تنظیم کی خوب ہی فرصت نصیب ہوئی۔ تقریباً روزانہ ایک مضمون لکھتا تھا اور اُسے سوشل میڈیا ذرائع پر شیئر کرتا تھا۔ ارادہ تو اِن مضامین کے مجموعے کو کرونا کے ختم ہوتے ہی شائع کرنے کا تھا، لیکن چند عوارض اور تعلیمی مصروفیات نے ساتھ نہ دیا اور یہ تمنا مؤخر ہوتی چلی گئی، پھر تبلیغ میں سال کے سفر پر جانا ہوا، جس کی روئیداد اِن شاء اللہ! عن قریب بیان کروں گا، اور یہ ارادہ مزید ایک سال ملتوی ہوگیا۔ بہرکیف، فی الوقت دل میں مچلتے اس ارمان کو پورا کررہا ہوں اور اُن مضامین کو سابقہ چند مفید مضامین کے ساتھ ملا کر شائع کررہا ہوں۔

مضامین میں کیا ہے؟ یہ تو اُنھیں پڑھ کر ہی معلوم ہوگا، البتہ اتنا بتاتا چلوں کہ ان میں مضمون

نگاری، منظر نگاری، مکالمہ (انٹرویو)، تجزیہ وتبصرہ، سفر نامہ، کہانی، نیز دیگر بہت سی اصنافِ تحریر شامل ہو چکی ہیں۔ امید کرتا ہوں کہ قارئین ان سے مستفید ہوں گے۔

یہ بات بھی واضح کرتا چلوں کہ اس کتاب کی طباعت کا مقصد محض شوق نہیں ہے، نہ ہی کبھی بھی کچھ بھی لکھنے کا یہ مقصد رہا ہے۔ اس کا مقصد قاری کے دل میں محنت اور لگن کا شوق بیدار کرنا، خود اِعتمادی پیدا کرنا، لوگوں کو لکھنے اور پڑھنے کی طرف لوٹانا اور اُنھیں تحریر کی مختلف اقسام سے واقف کروانا ہے۔ امید ہے کہ یہ کاوش مفید رہے گی۔

آپ کی نیک دعاؤں کا طلب گار سعد رفیق۔

نوٹ: اپنی آرا سے باخبر ضرور کیجیے گا۔ میرا اِی۔میل پتا آپ کے لیے حاضر ہے۔ کوئی اغلاط ہوں تو ان کی بھی نشان دہی کر دیجیے گا۔ جزاکم اللہ خیراً

saadrafiqgadit@gmail.com

تقریظ

اُستاذُ العلماء، اُستاذ الاساتذہ حضرت مولانا شیخ الحدیث یاسین صاحب دامت برکاتہم العالیہ
منصب : اُستاذ جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی
و مُہتمم و رئیس جامعہ ارشاد العلوم یوسفیہ کھتری مسجد کراچی

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے:

اغتنم خمسا قبل خمس: شبابك قبل هرمك، وصحتك قبل سقمك، وغناك قبل فقرك، و فراغك قبل شغلك، وحياتك قبل موتك۔

(پانچ چیزوں کو پانچ چیزوں سے پہلے غنیمت جانیں، اپنی جوانی کو اپنے بڑھاپے سے پہلے، اپنی صحت کو بیماری سے پہلے، اپنی مال داری کو فقیری سے پہلے، اپنی فراغت کو مشغولیت سے پہلے اور اپنی زندگی کو اپنی موت سے پہلے۔) (سنن النسائی)

کرونا وائرس کے ایام میں جب نظامِ زندگی پوری دنیا میں معطل ہو کر رہ گیا، حتی کہ حرمین شریفین میں حج وعمرہ اور روضہ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حاضری پر مساجد میں نمازوں اور تعلیم گاہوں میں تعلیم پر پابندیاں لگ گئیں، بہت سے لوگوں نے فراغت کے ان لمحات کو خواب غفلت میں گنوایا، جب کہ سعادت مند اور خوش قسمت لوگوں نے زندگی کے ان اوقات کو حدیث رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی روشنی میں غنیمت جانا اور کارآمد بنایا۔ برادر مخدوم مولانا مفتی سعد رفیق زید مجدہٗ، فاضل و متخصص جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن، ان خوش قسمت لوگوں میں سے ہیں جنھوں نے وقت کے ان لمحات کو قیمتی بنایا، متفرق مگر پُر اثر مضامین جمع کیے اور آخر میں اپنے استاد محترم مولانا محمد

عاصم ذکی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق طویل مضمون لکھا، اور اب اِسے زیور طبع سے آراستہ کرنے کی سعادت حاصل کرر ہے ہیں۔

مولانا سعد رفیق صاحب کی یہ خوش بختی ہے کہ بچپن سے مخدوم ومکرم شمس الصلحاء حضرت مولانا شمس الرحمن صاحب دامت برکاتہم کے دامن رشد و ہدایت سے وابستہ ہوئے اور اُن کے زیر تربیت رہ کر اُن کی ہدایات پر چلتے ہوئے ان کی دعاؤں کے مستحق بنے۔

مولانا سعد صاحب کو اللہ تعالی نے قابل رشک صلاحیتوں سے نوازا ہے۔ زمانہ طالب علمی میں عربی کتاب ''اسرار التفوق الدراسی'' کا ترجمہ کر کے مفید مضامین کے اضافے کے ساتھ شائع کیا، الحمد للہ یہ کتاب بہت مقبول ہوئی۔

دعا ہے کہ اللہ تعالی ان مضامین کو بھی شرف قبولیت عطا فرمائے اور ہر خاص و عام کے لیے کارآمد ومفید بنائے۔

ربنا تقبل منا إنك أنت السميع العليم

محمد یسین

۲۶ ذی الحجہ ۱۴۴۳

میں بھی ایک لکھاری ہوں

انسان کی ترقی اور تنزلی کا مدار اُس کی صلاحیتوں یا اس کے پاس موجود وسائل پر نہیں، بل کہ اس کی بلند یا پست ہمتی پر ہوتا ہے۔ باہمت شخص بے خوف وخطر ہر میدان میں کودتا پڑتا ہے اور اپنے آپ کو اُس میدان کا شہ سوار بننے کا اہل ثابت کرتا ہے، جب کہ بے ہمت شخص یا تو ہمیشہ لا پروائی، سستی اور کاہلی کا مجسمہ بنا رہتا ہے یا احساس کمتری کا شکار ہو کر دنیا اور اہل دنیا سے ڈرا رہتا ہے یا غلطی کے خوف سے گھبرایا رہتا ہے اور کوئی قدم اٹھانے کی جرأت نہیں کر پاتا۔

غالباً بطالت کے موضوع پر مشتمل عربی اشعار کے شاہ کار مجموعے "دیوان الحماسہ" ہی میں ایک شعر نگاہوں سے گزرا، جس میں شاعر اپنے ممدوح کی تعریف یوں کرتا ہے کہ خدا نے میرے ممدوح میں بزرگوں کا تجربہ اور نوجوانوں کا جنون، دونوں جمع کر دیے ہیں۔ اللہ پاک ہم سب کو اس شعر کا سچا مصداق بنا دے۔

جب آدمی یہ یقین کر لے کہ میں بھی لکھ سکتا ہوں، میں بھی آگے بڑھ سکتا ہوں، میں بھی کچھ کر سکتا ہوں، تب جا کر اس کی گاڑی صحیح معنوں میں پٹڑی پر چڑھتی ہے۔ زیادہ خود اِعتمادی جسے ''اوور کانفیڈنس'' کہتے ہیں، اگرچہ ایک مہلک مرض اور تباہ کن بیماری ہے، مگر اِس کے بالکل برعکس خود اِعتمادی، جسے ''سیلف کانفیڈنس'' کہتے ہیں، کا سِرے سے نہ ہونا انسان کو دنیا کا ایک ناکام مسافر بنا کر رکھ دیتا ہے۔

مشہور قول ہے: ''تحریر کا خاکہ مطالعے سے تشکیل پاتا ہے اور تجربے ہی سے انفرادیت پیدا ہوتی ہے''، لہٰذا ہمیں پوری تن دہی سے اس کام کی طرف متوجہ ہونا ہوگا اور اِس فن کے حصول کے

لیے دل لگا کر اَن تھک محنت کرنی ہوگی، تبھی ہم اپنے اساتذہ سے صحیح معنوں میں فیض یاب ہو پائیں گے۔

جنگ اخبار کے ایک قدیم ایڈیٹر کے متعلق سنا ہے اور شاید مبالغہ آرائی ہی میں وہ یہ فرما رہے ہوں گے، کہ لکھنے کا طریقہ یہ ہے کہ بس لکھو، جو دل میں آئے لکھو۔ اگر گالیاں ہی ذہن میں آ رہی ہوں تو وہی لکھ دو۔

بندے کو اپنا درجۂ اولی کا سال یاد ہے، جب خصوصاً عربی کے بے پناہ شوق نے اسے اس مضمون میں بے حد محنت کرنے پر مجبور کیا اور اِسی سال بقرہ عید کی چھٹیوں میں جمال القرآن اور نحو میر کے پڑھائے گئے تمام اسباق کو عربی زبان میں منتقل کر دیا، گو کہ چند سالوں بعد اُسے بعض غلطیوں پر مشتمل دیکھ کر خود ہی تلف کر دیا، لیکن اس محنت نے جہاں میری مہارت میں اضافہ کیا وہیں نئی نویلی زبان سے میرے ڈر اور خوف کو بھی ختم کر دیا۔ مشہور اُردو ادیب مشتاق احمد یوسفی مرحوم کہتے ہیں کہ لکھنے کے بعد اپنے مضمون کو چھے مہینے تک الماری میں بند کر کے رکھ دو، اس کے بعد کھول کر دیکھو گے تو تمھیں اس کے نقص نظر آئیں گے۔

اب حقیقت سے بے خبر رہ کر اپنے آپ کو بڑا لکھاری سمجھ لینا تو حماقت کی انتہا ہے، لیکن میں اپنی شناخت ایک باہمت طالب علم کی حیثیت سے ضرور کرانا پسند کروں گا، جو اپنے اساتذۂ کرام کی بے پناہ اعتنا اور خصوصی توجہات و اِرشادات کا دائمی محتاج رہے گا۔

مطالعہ و مشاہدہ

مطالعے اور مشاہدے کی اہمیت کا ادراک شاید بڑوں سے زیادہ چھوٹے بچوں کو ہوتا ہے۔ نہ کوئی شرم، نہ کوئی حیا، نہ کسی کا خیال اور نہ کسی کی پروا، بس تجسس ہی تجسس، ایران توران کی باتیں، ہر چیز کے متعلق سوال، بے ربط و بے ہنگم، واقعی اور فرضی، ہر طرح کی گفتگو اور دنیا جہاں کی فرضی کہانیاں، بل کہ شاید ہر بچہ ہی اشتیاق احمد سے بڑا کہانی نویس ہوتا ہے۔

تخلیقی مزاج، فطری زندگی اور مشاہداتی ذوق پیدا کرنے کے لیے اور منظر کشی کے میدان کا شہ سوار بننے کے لیے بچوں کا مطالعہ، ان کے ساتھ وقت بِتانا اور اُن کی نفسیات سمجھنے کی کوشش کرنے سے بہتر کم از کم میری نظر میں تو اور کوئی طریقہ نہیں ہے۔ شاید اپنی اس بات میں، میں سو فی صد غلط بھی ہوں اور شاید کچھ صحیح اور کچھ غلط بھی، لیکن اب تک کی میری سوچ نے مجھے اسی مقام پر لا کھڑا کیا ہے اور یہی میرے ذاتی تجربوں کا نچوڑ ہے۔ ہمیں بچہ بننا ہوگا، ہر چیز پر غور کرنا ہوگا، کچھ بے فکری، تھوڑا الاُبالی پن اور ہر بات پر ڈھیر سارا تجسس، اسی سے ہم اپنے اس مقصد میں کام یاب ہو سکیں گے۔ اور لکھتے وقت اگر ہم مضمون کو ایک ایسی کہانی فرض کر لیں جو ہم نے ایک انتہائی شرارتی بچے کو زبانی سنانی ہے اور اُس میں اس بات کا بھی خیال رکھنا ہے کہ کہانی اتنی دل چسپ اور سنسنی خیز ہو کہ بچے کا دھیان ایک لمحے کے لیے بھی اس سے ہٹنے نہ پائے، تب شاید ہم اپنے ہدف کو پا سکیں گے۔

اس واقعے ہی کو لے لیجیے:

جمعے کا دن تھا، موسم بھی گرمی کا اور پھر تپتی ہوئی دھوپ، نمازِ جمعہ ادا کرنے کے بعد میں اور میرا

بھانجا معاذ گھر کا کچھ سودا سلف لے کر واپس آ رہے تھے۔راستے میں، میں نے ایک خوب صورت سفید بلی کو دیکھا اور دیکھتا رہا، اس کی نیلی چمکتی پیار بھری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اُسے گھورتا رہا اور وہ بھی مجھے گھورتی رہی، دل چاہا کہ اسے اٹھا کر گھر لے جاؤں، اسے تھوڑا نہلاؤں، کچھ کھلاؤں پلاؤں، لیکن سابقہ تجربات اور اپنی محبت کے عارضی اور پل بھر کے ہونے نے مجھے مجبور کر دیا کہ میں اس خیال کو وہیں دفن کر کے چلتا بنوں۔

ہم تھکے ہارے، پسینے سے چور جب بلڈنگ کے پنجرے نما دروازے کے باہر پہنچے تو اچانک میری نگاہ وہاں موجود موٹر سائیکل پارکنگ میں موٹر سائیکل اور کیاریوں کے درمیان کچرے کی گاڑی پر پڑی۔جمع دار بلڈنگ کا کچرا جمع کر کے پہلے وہیں لا کر رکھتا تھا، پھر وہاں سے آگے لے کر جاتا تھا۔اس سے پہلے کہ میں اپنی یہ بات مکمل کروں، میں قارئین کو بہرحال یہ بات بتا دینے سے دریغ نہیں کروں گا کہ بچپن میں، میں نے بہت کارٹون دیکھے ہیں، اپنے گھر میں، نانی کے گھر میں اور جب بس چلا، پڑوسیوں کے گھر میں جا کر بھی کارٹون دیکھے ہیں۔جب یہ نہ ہو سکا تو پڑوسی کے گھر کے باہر بیٹھ کر گرل سے جھانک کر بھی مزے لے لے کر کارٹون دیکھے ہیں۔میں اپنے گناہ کی تشہیر نہیں کر رہا، اس وقت میری عمر ہی کیا تھی اور میں کوئی بالغ اور مکلف تھوڑا ہی تھا، میرا سب سے پسندیدہ کارٹون ٹام اینڈ جیری ہوتا تھا، جو کہ ایک چوہے بلی کا کھیل تماشا تھا، جس میں دونوں آپس میں لڑتے رہتے اور چوہا ہمیشہ بلی پر غالب رہتا تھا۔بلی کا نام ٹام اور چوہے کا نام جیری تھا، شرارت اور مستی کے اس کھیل میں مثبت کردار جیری ہی کا تھا اور بچے بھی جیری ہی کو پسند کرتے تھے۔ اور صرف یہی نہیں، بل کہ مجھے اس کی وجہ سے چوہے اچھے لگتے تھے، یہاں تک کہ ایک مرتبہ جب امی جان نے بتایا کہ ابو جی کی نئی جیکٹ کو چوہے نے کتر لیا ہے تو یہ بات میرے لیے سمجھنا نہایت مشکل ہو گئی تھی کہ امی جان! اتنا اچھا جیری، ہم سب کا ہیرو، آخر یہ کام کیوں کر کر سکتا ہے۔

خیر، اب میں اپنی بات کی طرف لوٹتا ہوں، میں اس کچرے کی گاڑی کے پاس سے گزر رہا تھا

کہ مجھے آہٹ محسوس ہوئی، کیا دیکھتا ہوں کہ دو بدشکل چوہے بہت تیزی سے دوڑتے ہوئے آتے ہیں اور کچرا گاڑی میں پڑی کچرے کی تھیلی میں سوراخ کر کے گھس جاتے ہیں، گویا کوئی بہت ہی بڑا خزانہ ان کے ہاتھ لگ گیا ہو۔ اس وقت کے میرے تخیلات مجھے وہیں کھڑا کر دیتے ہیں اور میں سوچ کی ایک نئی دنیا میں قدم رکھ لیتا ہوں، پھر کچھ دیر میں ایک آواز آتی ہے: ''ماموں! کیا دیکھ رہے ہو؟ وہ تو چوہے ہیں، آگے بھی چلیں۔''

تخیل کی دنیا سے نکلنے کے بعد میں نے معاذ کو سارا ماجرا سنایا اور بتایا کہ میں کیا سوچ رہا تھا۔

''معاذ! یہ میڈیا والے بھی کتنے خطرناک ہوتے ہیں، انسان کا ذہن ہی بدل کر رکھ دیتے ہیں، مثبت کو منفی اور منفی کو مثبت بنا کر دکھانا تو اِن کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ ٹام اینڈ جیری کارٹون ہی کو لے لو، اتنی پیاری بلی کو کس طرح وِلن بنا کر پیش کیا ہے اور اِس بدمعاش اور بدکردار چوہے کو دیکھو، اسے ہر بچے کا ہیرو بنا کر رکھ دیا ہے۔''

آمدم برسرِ مطلب! مطالعہ، آہا...... مطالعے کی تو کیا ہی بات ہے! جب تک مطالعہ نہیں تب تک کوئی سوچ اور نظریہ نہیں اور جب تک کوئی نظریہ نہیں تو ہماری کوئی شناخت نہیں اور جب ہماری کوئی شناخت ہی نہیں تو ہماری بات کی بھی کوئی اہمیت نہیں۔

کہتے ہیں کہ اتنا پڑھو کہ جب تم لکھو تو لوگ پڑھیں۔ ابن القیمؒ اپنی مشہور کتاب ''صید الخاطر'' میں رقم طراز ہیں کہ باہمت انسان ہر چیز سیکھنا چاہتا ہے اور ہر علم کے حصول کے لیے ہر وقت کوشاں رہتا ہے اور اُس کی ہمت اسے اس بات پر مجبور کرتی ہے کہ محض سرسری معلومات پر اکتفا نہ کرے، بل کہ ہر علم وفن میں انتہا تک پہنچے اور اُس میں کمال حاصل کرے۔ اور یہ بات لازمی سی ہے کہ اس کمال کا حصول اَن تھک مطالعے کے بغیر ممکن نہیں۔

مطالعے سے متعلق ایک اور قیمتی بات بھی یاد رکھنا ضروری ہے کہ مواد کے انتظار میں طویل عرصے بیٹھے رہنا اور اِنشا و کتابت کی طرف نہ آنا بھی بے وقوفی ہے، یہ کوئی منصب قضا و اِفتا نہیں کہ اس

کے لیے اتنی احتیاطیں برتی جائیں، جتنا مواد ہو اُسے بروئے کار لاتے ہوئے کچھ نہ کچھ لکھنا شروع کر دینا چاہیے اور ساتھ ہی مطالعے کی رفتار اور مقدار کو بھی بڑھاتے رہنا چاہیے۔ مشہور انگریز لکھاری شیکسپیئر کی کتابیں، اس کی قدیم انگریزی اور قلت لغات دیکھ کر ناقدین کیا، عام قاری بھی یہ کہنے پر مجبور ہوتا ہے کہ اس اَن پڑھ کے پاس ذخیرۂ الفاظ کچھ زیادہ نہ تھا، نہ ہی مواد کچھ زیادہ تھا، البتہ اس کے پاس جو کچھ تھا اس نے اسے بہت ہی اعلیٰ انداز سے پیش کیا، جس کی وجہ سے اس کی کتابیں آج تک پڑھی جاتی ہیں اور مختلف زبانوں میں مترجم بھی دست یاب ہیں۔

ہاں، جتنا مطالعہ ہوگا اتنے ہی ہم ''قلیل اللفظ کثیر المعنیٰ'' کا مصداق بنیں گے، یقین نہ آئے تو موجودہ دور کی بیش تر تسہیلات اور اُن کے مقابل متقدمین کی کتابیں دیکھ لی جائیں، تفسیر و حدیث، علم منطق، علم کلام، نیز ہر فن میں ان شاء اللہ! آپ میری اس بات کو سچا پائیں گے۔ ہر قاری معمولی جستجو کے بعد میری اس بات کی صداقت کا فیصلہ کر سکتا ہے اور اپنا تجزیہ پیش کر سکتا ہے۔

امام احمد بن حنبلؒ نے ویسے ہی چالیس سال کنوارے رہ کر نمک کے سالن اور لوگوں کے جھوٹے کھانے پر اِکتفا نہیں کیا، بل کہ بہت کچھ حاصل کر کے اور اِس دنیا کو بہت کچھ دے کر اِس دنیا سے رخصت ہوئے۔

ہم علم میں اپنے اسلاف کے عشر عشیر بھی نہیں ہیں اور نہ ہی ہماری اس درجے کی قربانیاں ہیں، البتہ ان کے واقعات پڑھنا، ان کی باتیں سننا اور اُن اہل عصر علما کے ساتھ رابطہ قائم کر لینا جو ہمیں ان سے ملانے میں پُل کا کام سرانجام دے سکیں، ہمارے لیے باعث صد اِفتخار ہوگا۔

یہ بات بھی سچ ہے کہ ہمیں علم دین میں رسوخ اور کمال کے لیے آگے نہیں، بل کہ پیچھے جانا ہوگا، ہمارے لیے ہمارے اکابر بہت بڑا خزانہ چھوڑ کر جا چکے ہیں، جسے کھنگال کر ہی ہم علم کا سفر کام یابی کے ساتھ طے کر سکتے ہیں۔

ہم نشین و دِل ربا، مطالعہ

’’اگر زندگی کی تمام آزادیوں سے محروم ہونے پر بھی لکھنے پڑھنے کی آزادی سے محروم نہیں ہوں اور اُس کے نتائج محفوظ ہیں تو زندگی کی راحتوں میں سے کوئی راحت بھی مجھ سے الگ نہیں ہوئی، میں اس عالم میں پوری زندگی بسر کرسکتا ہوں۔‘‘

(مولانا ابوالکلام آزاد جیل میں رقم طراز ہیں۔)

دوستو! حقیقت سمجھو یا افسانہ، وقت کبھی نہ کبھی تو تم سے یہ بات منوا کر ہی رہے گا کہ کتابوں سے بڑھ کر تمھارا کوئی قیمتی دوست نہیں ہے۔

آجاؤ گے حالات کی زد میں جو کسی دن
ہوجائے گا معلوم ، خدا ہے کہ نہیں ہے

احسان دانش کے یہ اشعار جس طرح یہ دعویٰ کررہے ہیں کہ کبھی تو تمھیں خدا کی خدائی ماننی ہی پڑے گی اسی طرح بندہ بھی آج یہ دعوے دار ہے کہ ایک نہ ایک دن ہر شخص اس بات کے اعتراف پر مجبور ہوگا کہ کتاب سے زیادہ مخلص، وفادار اور فائدے مند دوست اس کا کوئی نہیں۔ کتاب خوشی، غم، آسودگی، بدحالی، کسی موقع پر بھی تنہا نہیں چھوڑتی اور جب بھی وہ کتاب کی طرف متوجہ ہوگا کتاب بھی اس کی طرف متوجہ ہوجائے گی۔

صرف یہی نہیں، بل کہ کتب بینی آپ کے لیے بے شمار اور بیش بہا علمی خزانے مہیا کرے گی، آپ کے ذہن کو جِلا بخشے گی، دنیا جہاں کے بادشاہوں کو آپ کے قدموں میں لاکھڑا کرے گی، عزت، دولت، شہرت، ہر شے سے آپ کو مالا مال کردے گی، خیر و شر کا فرق آپ پر آشکارا

ہو جائے گا، معرفت الٰہی اور قربِ خداوندی کا باعث ہوگی، بڑے بڑے اہل اللہ اور میدانِ علم و عمل کے شہ سواروں سے آپ کی ملاقات کرائے گی، آپ کا ان سے گہرا روحانی رشتہ قائم کر دے گی۔ ہر علم و فن کے موجد، موسس، سر براہ و شہ سوار کو جانچنے، پرکھنے، سمجھنے اور پہچاننے میں آپ کی معاون ثابت ہوگی اور آپ کو ایسی بلندی عطا کرے گی کہ بڑے بڑے معاصر علما اور ماہرین فن آپ کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر اور آپ کی عزت افزائی پر مجبور ہو جائیں گے۔

مطالعہ کتب پوری دنیا کو آپ کی انگلیوں کے درمیان لا کر رکھ دے گا۔ جس طرح بچہ گیند اپنے ہاتھوں میں تھام لیتا ہے اور اپنی انگلیوں میں نچاتا ہے اور یہ تأثر پیش کرتا ہے کہ وہ اس پر مکمل تصرف اور اِختیار رکھتا ہے، دنیا بھی اسی طرح آپ کے ہاتھوں میں ہوگی، اس کی رنگینیوں اور حقائق سے آپ بخوبی واقف ہوں گے۔ ماضی، حال اور مستقبل، ہر چیز پر آپ کی بخوبی گرفت ہوگی، آپ ایک راہ نما ہوں گے، مقتدا اور اِمام ہوں گے۔

آپ کسی سے آشنا ہوں یا نہ ہوں، ساری دنیا آپ سے آشنا ہوگی، آپ کو سننا چاہے گی، آپ کی رائے جاننا چاہے گی، دیدۂ دل سے آپ کی زیارت کی آرزو رکھے گی، بڑے بڑے علمائے وقت کو آپ کی طرف متوجہ کر دے گی۔

کہنے میں شاید آپ اپنے آپ کو کچھ نہ کہیں، لیکن لوگ آپ کے کمالات کا اعتراف کرنے پر مجبور ہوں گے۔

علامہ ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ کی شان و شوکت، ان کی تصانیف اور اُن کے مقام و مرتبے سے سبھی واقف ہوں گے۔ وہ خود تو اپنے بارے میں یہ لکھ گئے کہ ”میں نے بڑوں کے مقام تک پہنچنے کی بہت جستجو کی، عمر گزر گئی، لیکن وہیں کا وہیں رہا۔“

یہ تو اُن کے الفاظ ہیں، مگر وہ کیا تھے اور کیسے بیش بہا ہیرے تھے، یہ آج ساری دنیا جانتی ہے۔ ہر شخص ان کی کتابوں کے ذریعے ان سے روحانی رشتہ اور ناتا قائم کرنے کا اشتیاق رکھتا ہے

اور اُن کے ذوقِ مطالعہ اور اِستعدادِ علمی سے بھی واقف ہونا چاہتا ہے۔

مطالعے سے ملنے والی عزت کا اندازہ آپ ''المدخل فی الشفاء للقاضی عیاض'' میں مذکور اِس واقعے سے بھی لگا سکتے ہیں کہ ایک مرتبہ مؤلف رحمۃ اللہ علیہ کے علاقے میں علما کا اس مسئلے میں اختلاف ہو گیا کہ درود شریف میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے احمد کا لفظ استعمال کرنا درست ہے یا نہیں؟ بڑے بڑے علما اس مسئلے کی چھان بین میں لگے رہے۔ مؤلف کی چچا زاد بہن نے یہ بتایا کہ الشفاء میں حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے ایک درود شریف منقول ہے، جس میں احمد کا لفظ استعمال ہوا ہے اور اُسے نکال کر پیش کر دیا۔ بڑے بڑے علمائے وقت اس پر حیران ہوئے اور اُس لڑکی کی بہت پذیرائی ہوئی۔ اسی طرح مؤلف رحمۃ اللہ علیہ خود کسی عالم سے ملنے تشریف لے گئے جو کتاب الشفاء سے بے انتہا شغف رکھتے تھے، ان سے کسی مسئلے پر گفتگو ہوئی تو مؤلف نے بتایا کہ قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بات شفا میں لکھی ہے۔ ان عالم دین نے کہا کہ اگر واقعی ایسا ہے تو میری طرف سے تمھیں کتاب الشفاء کا ایک نسخہ اور اُس کے علاوہ ایک کتاب ہدیہ ہوگی، چناں چہ وہ مسئلہ کتاب سے دریافت ہوا اور مؤلف کی بڑی حوصلہ افزائی بھی ہوئی۔

مطالعے کے زور پر آدمی کبھی تو تاریخ الملوک والامم معلوم کرتا ہے تو کبھی مفت میں ابن بطوطہ کے ساتھ ساری دنیا کا سفر طے کر لیتا ہے اور مختلف اقوام و تہذیبات کا مشاہدہ کر آتا ہے اور کبھی کتاب الزہد، رسالہ قشیریہ، احیاء العلوم جیسی کتابوں کے ذریعے اعلیٰ ظرفی، علم الاخلاق اور تقویٰ اور پرہیزگاری کے اسباق حاصل کرنے لگتا ہے اور کبھی مکتوبات مجددیہ و معصومیہ اور فصوص الحکم جیسی کتابوں کے ذریعے روحانی دنیا کی سیر کر آتا ہے۔

ہر دِن ایک نئی کہانی، ایک نئی منزل اور نیا سفر طے کرنے کے لیے اپنا رختِ سفر تیار کرتا ہے۔ ایک کپ چائے، تھوڑا سا ناشتا، پھر سارا دن ایک بند کمرا اور اُس میں وہ اور کتابیں! دنیا والے کبھی اس بات کا سراغ نہیں لگا سکتے کہ قاری اس وقت کس دنیا میں گم ہے، بس ایک الگ ہی جہاں ہے

اور ایک الگ ہی سماں ہے۔ وہی جانتا ہے کہ کیسے وہ ان کتابوں کے ذریعے ساری دنیا سے آزاد اور بے گانہ ہوکر اپنی ذہنی دنیا آباد کرنے میں مگن ہے اور کس وقت وہ دنیا کے کس کونے میں ہے یا تاریخ کے کس حصے میں گم ہے۔

چاہے معلم ہو یا متعلم، مصنف ہو یا مؤلف، ناقل ہو یا مجتہد، ادیب ہو یا شاعر، تاجر ہو یا ملازم، کوئی شخص بھی اس کے بغیر ترقی نہیں کرسکتا، بل کہ جو شخص جتنا بڑا ہوتا ہے اتنا ہی وہ اس کا محتاج ہوتا ہے۔

علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ نے تعطیل کے دنوں کو ''ایام النشاط والاستعداد للدرس القابل'' شمار کیا ہے اور اِسی بنا پر مدرس کے لیے ان ایام کی تنخواہ لینے کو بھی جائز کہا ہے اور یہ استعداد مطالعے ہی سے حاصل ہوتی ہے۔

اللہ پاک ہمیں اپنے اوقات قیمتی بنانے اور فرصت سے بھرپور فائدہ اٹھانے کی توفیق نصیب فرمائے۔آمین!

اندازِ بیاں گرچہ بہت شوخ نہیں ہے
شاید کہ اتر جائے ترے دل میں مری بات

سوچ پر منحصر کلام تیرا

علم سے وابستہ ہر اِنسان ایسی زبانیں سیکھنے کا محتاج ہوتا ہے جن میں علوم وفنون کا ذخیرہ موجود ہو۔ اہلِ علم، زبان دانی کو کبھی نظر اَنداز نہیں کرتے۔ زبان کا سیکھنا علم کی راہ کے مسافر کے روشن مستقبل کے لیے ضروری کیوں نہ ہو کہ علمی میدان میں اعجاز پیدا کرنے اور اپنا لوہا منوانے کے لیے متعلقہ زبان میں مہارت حاصل کرنا، فصاحت و بلاغت سے آراستہ ہونا اور فنِ اِنشا وخطابت میں کمال پیدا کرنا، زبان وقلم کے اولین تقاضوں میں سے ہے۔

اور کمال بھی ایسا ہونا چاہیے کہ کسی کو مذاق اڑانے کا یا متکلم کو ہلکی یا غیر معتد بہ نگاہ سے دیکھنے کا موقع نہ ملے، اس کے کلام میں لسانیت کی بُو نہ آئے اور کسی اور زبان سے مشابہت نظر آئے، نہ لہجے میں، نہ انداز میں اور نہ کلام میں، کسی بھی طریقے کی آمیزش نہ ہو۔ ہاں، اگر کسی غیر زبان کا لفظ استعمال کرنا پڑ جائے تو بھی اس کا طریقہ یہ ہے کہ اس کا حلیہ بالکل بگاڑ دیا جائے اور اُسے اپنی زبان کی ساخت میں ڈھال دیا جائے، تب ہی جا کر اُس زبان کا حق ادا ہو پائے گا۔

اہلِ علم حضرات کے لیے جو زبانیں قابلِ اعتنا ہیں، جن میں ان کی محنت، جستجو اور لگن مقصود ہے وہ خصوصاً عربی، اردو اور فارسی ہیں اور چوں کہ استعماری قوتوں کا دنیا میں اس وقت غلبہ ہے اور مسلمانوں میں ان کے چاہنے والے اور مغرب زدہ لوگ بھی بکثرت پائے جاتے ہیں اور افسوس یہ ہے کہ جدید دنیاوی علوم اور مستند معلومات بھی بکثرت انھی زبانوں میں دست یاب ہیں تو بوجہ ضرورت ان اہلِ مغرب کی زبان بھی سیکھ لینی چاہیے، اب چاہے وہ انگریزی ہو یا فرانسیسی یا ہسپانوی، اس کا مدار اہلِ علم حضرات کے درمیان رائج زبان پر ہے۔

کسی بھی زبان کو سیکھنے کے لیے سب سے پہلے ہمیں اس زبان کو لکھنا، بولنا اور سننا پڑے گا، بل کہ اہل لسان کے ماحول میں رہنا ہوگا، ماہرین کے درمیان وقت گزارنا ہوگا، ان کی گفتگو کو اُن کی زبان سیکھنے کے ارادے سے سننا ہوگا، تاکہ ہم صحیح اور مستند مواد اپنے ذہنوں تک پہنچا سکیں اور جب ہم بولیں یا لکھیں تو بھی ہم سے صحیح ادائیگی ہی ہو۔

میر تقی میرؔ ایک مرتبہ تانگے میں سوار کہیں جا رہے تھے۔ راستے میں بہار کے کسی شخص نے ان سے سواری کی مدد مانگی اور کہا کہ بس نزدیک ہی جانا ہے، ایک گلی کا فاصلہ ہے۔ میر تقی میر صاحب نے ساتھ بٹھانے سے انکار کر دیا اور دل میں کہا کہ تمھارے لیے تو ایک گلی کا فاصلہ طے کرنا ہوگا، مگر میری تو پوری اردو داؤ پر لگ جائے گی!

لہٰذا ہمیں اس بات کا خیال بھی رکھنا چاہیے کہ ہم لسانی اعتبار سے صرف مستند لوگوں کو سنیں اور پڑھیں یا کسی ایسے شخص کو سنیں جو اگر چہ اہل لسان نہ ہو، لیکن محنت سے ان کے ہم پلہ ہو چکا ہو، بل کہ ایک راز کی بات یہ بھی ہے کہ جو شخص اہل لسان نہ ہونے کے باوجود اِس درجۂ کمال کو پہنچ چکا ہو وہ زبان سیکھنے کے حوالے سے زیادہ راہ نمائی بھی فراہم کرسکتا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ان تکالیف اور مشکلات سے گزر چکا ہوتا ہے جن سے مبتدی طالب علم گزر رہا ہوتا ہے، جب کہ اہل لسان طبقے کو یہ دولت گود ہی میں مل جایا کرتی ہے۔

ابتدا میں لسانی اعتبار سے کمزور لوگوں کو سننا یا پڑھنا انتہائی نقصان دہ ہے۔ ایک مرتبہ غلط تعبیرات، الفاظ کا بے محل استعمال ذہن میں نقش ہو گیا تو اُسے زائل کرنے میں ہی بہت وقت لگ جائے گا۔

ساتھ ساتھ ہمیں اس بات کی بھی کوشش کرنی چاہیے کہ ہم اس زبان کو اپنے اوپر سوار کرلیں، صرف گفتگو اور کتابت کے وقت ہی نہیں، بل کہ کم از کم سیکھنے کے دوران میں اپنے دن بھر کے افکار، یہاں تک کہ حدیث النفس بھی اسی زبان میں منتقل کرلیں، تب جا کر اُس میں کمال حاصل ہو پائے گا اور یہ زیادہ مشکل بھی نہیں ہے، بس اس کے لیے سچے جذبے اور لگن کا ہونا شرط ہے۔

الحمدللہ! اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے بندہ اردو، عربی اور انگریزی، تینوں زبانوں میں اپنے افکار کو منتقل کر سکتا ہے اور اِن تینوں زبانوں میں تحریراً اور تقریراً اپنے مافی الضمیر کو اَدا کر سکتا ہے۔ یہ محض ربِ ذوالجلال کا فضل و اِحسان ہے۔ جو کچھ ملا ہے اسی کی دین اور عطا ہے اور اللہ پاک سے مزید ترقی اور بہتری کی امید ہے۔

اس زبان میں نہ سوچنے سے متعلق جسے آپ زیرِ قرطاس لا رہے ہوں، ایک دل چسپ واقعہ قارئین کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔

بندہ مدرسے کے چوتھے درجے میں زیرِ تعلیم تھا، اہلِ پشتو میں سے میرا ایک ہم سبق دوست تھا۔ استاد جی کی راہ نمائی پر اُس نے امتحان کی تیاری کے لیے فرضی سوالات حل کرنا شروع کیے اور ایک مرتبہ لکھ کر مجھے بھی دکھا دیے اور صرف ایک ہی مرتبہ دکھائے۔

''کا، کی، کے'' کا کیا ہی خوب استعمال کیا تھا، کتنا بہترین الفاظ کا چناؤ اور اَوجِ ثریا سے کود کر آئی ہوئی اردو تعبیرات۔ کیا ''تھا'' اور ''تھے'' کے ٹھاٹھیں مارتے سمندر! بہت مشکل سے میں نے وہ تحریر مکمل کی اور اپنی ہنسی ضبط کرتا رہا۔

اس وقت پہلی بار میرے ذہن میں یہ خیال آیا، نہ جانے الہام تھا یا کیا تھا، بہر حال، میں نے اس سے پوچھ ہی لیا: ''بھائی جان! تم پشتو میں سوچ کر تو اُردو میں نہیں لکھتے؟'' جواب بھائی جان کا اثبات میں تھا۔ اس سے پہلے نہ مجھے کسی نے یہ بات سمجھائی تھی اور نہ میں نے کہیں پڑھی تھی، لیکن قدرتی طور پر میرا عمل یہی رہا تھا کہ جس زبان میں سوچو، اسی میں بولو۔ کسی نے مجھے یہ سمجھایا ہو یا نہیں، میں نے اس دوست کو یہ بات بخوبی سمجھا دی۔ اس کے بعد دوستی تو رہی، مگر شاید اِس نوعیت کا تعلق پھر شاید برقرار نہ رہ پایا۔

اس طولانی مضمون میں مذکور تمام باتوں کا عرق العرق اور نچوڑ وہی ہے جو ہمارے استاد مشفق خاص اکثر اپنے مضامین کے آخر میں لکھا کرتے ہیں: ''آگے بڑھیے، ہمت کیجیے، کوشش کیجیے۔''

میڈیا کی یلغار: توپ یا تلوار

یقیناً موجودہ دور میڈیائی جنگ (میڈیا وار) کا ہے۔ دنیا کے سارے دھندے، نظریے ہی کی بنیاد پر قائم ہیں۔ مال خرچ کرنا، صلاحیتیں لگانا، وقت صرف کرنا، بل کہ جان کی بازی تک لگا دینا صرف اسی بنیاد پر ہوتا ہے کہ انسان کا ذہن بنا دیا جاتا ہے کہ فلاں کام کرنا ہے اور فلاں نہیں کرنا۔

اسی طرح کسی کو چاہنا، کسی سے نفرت کرنا، کسی قوم، گروہ یا سیاسی پارٹی کی حمایت اور کسی کی مخالفت کرنا، یہ سارا کچھ بھی اسی بات پر موقوف ہے کہ میڈیا میں اسے کیسا دکھایا جا رہا اور کیسا بتلایا جا رہا ہے۔ یہ ایک غیر معمولی حقیقت ہے جس کا اعتراف کیے بغیر چارہ کار نہیں۔

کوئی انسان کسی دوسرے کو اُس کے پیسوں یا آرائش کی بنیاد پر نہیں چاہتا، بل کہ اگر کسی کو چاہا جاتا ہے اور کسی شخص، قوم یا حکومت کو لوگوں کی حمایت اور تائید ملتی ہے تو اُن کے کردار، رویے اور خدمات ہی کے عوض ملا کرتی ہے اور اگر مخالفت کی جاتی ہے تو اُس کی بنیاد بھی یہی باتیں ہوتی ہیں۔

پیسوں کی بنیاد پر دِل سے کبھی کسی کو اپنا ہم نوا نہیں بنایا جا سکتا، نہ ہی مضبوط بنیادوں پر اُسے اپنی حمایت کے لیے کھڑا کیا جا سکتا ہے۔ اصل چیز کردار ہے، جس کا یا تو اِنسان حامل ہو یا اسے اس کردار کا حامل بنا کر پیش کیا جائے۔

مندرجہ بالا باتیں اپنے اندر مثبت اور منفی، دونوں پہلو رکھتی ہیں اور اُنھی پر اَثرات مرتب ہوتے ہیں۔

کسی کا بھی کردار اور اُس کی خدمات یا تو اُس شخص پر ظاہر ہوتی ہیں جو اُس صاحبِ کردار سے مل چکا ہو اور اُس کی صحبت میں رہ چکا ہو، یا پھر بڑے پیمانے پر جو اُس کی صفات کا پرچار ہوتا ہے

وہ میڈیا کے ذریعے ہوتا ہے۔

مختصر یہ کہ کسی شخص کو یا تو وہ شخص پرکھے گا جس کی موصوف سے ملاقات ہو یا پھر دوسرا ذریعہ موصوف کو پہچاننے کا میڈیا ہے۔ ملاقات نہ کرنے والے افراد کو موصوف سے متعلق مثبت و منفی کردار کی جو جان کاری ہو پائے گی وہ میڈیا ہی کے ذریعے ہوگی۔

اب کڑی سے کڑی جوڑیے۔ تمام باتوں کا خلاصہ یہی ہے کہ عام مجمع میں، عوام کے درمیان اور اکثریت کے نزدیک آپ وہی ہیں جو میڈیا آپ کو دکھاتا ہے۔ آپ کا کردار، آپ کی خدمات، آپ کا خیر وشر وہی ہے جس کے متعلق میڈیا آگہی فراہم کرتا ہے۔ اگر میڈیا آپ کو ہیرو بنا کر پیش کرے گا، سب آپ کو چاہیں گے، آپ پر جان نچھاور کریں گے۔ ہر طرح سے آپ کی حمایت کے لیے کھڑے ہوں گے اور اگر میڈیا آپ کو دشمن بنا کر پیش کر دے، قدامت پرست، انسان دشمن، جاہل، وحشی جیسے القاب آپ کو دے دے تو دنیا بھی آپ کو ویسا ہی مانے گی۔

میڈیا کا استعمال ہر طرح سے اور ہر اَنداز سے ہوتا ہے اور انتہائی تیزی سے اس کے وار کیے جاتے ہیں۔ موجودہ دور میں تو اِس کا اثر ہوا کی تیزی سے پھیلتا ہے۔ اسلام کو دہشت گرد، مولویوں کو قدامت پسند، جاہل اور غنڈے، جب کہ مدارس کو دہشت گردی کے اڈے سمجھنا اور سمجھانا سب اسی کا شاخسانہ ہے۔

ان تمام باتوں سے مقصود میڈیا کی اہمیت منوانا اور اہل حق کو اِس کی طرف متوجہ کرنا ہے۔ آج کے اس دور میں اہل حق کے لیے ان وسائل کا استعمال از حد ضروری ہو گیا ہے اور اَب ان ہتھیاروں سے لیس ہونا ناگزیر ہے۔

اس کی وجہ بھی واضح کرتا چلوں، غلط آدمی بھی بسا اوقات اپنی بُرائی سن کر غیرت مندی کا مظاہرہ کر ہی لیتا ہے اور اُس برائی سے باز آجاتا ہے، ورنہ کم از کم لوگوں کو بُرائی کی خبر ہو جاتی ہے اور ویسے تو جسے اللہ رکھے، اسے کون چکھے، لیکن بعض مرتبہ سیدھی راہ پر گام زن لوگ بھی میڈیا کے غلط

پروپیگنڈوں کے باعث حوصلہ شکنی کا شکار ہوجاتے ہیں۔تبلیغ سے وابستہ نوجوان دین داری سے منہ موڑ لیتا ہے، مدرسے کا طالب علم مدرسہ چھوڑ دیتا ہے اور سیاست سے منسلک شخص سیاست ہی سے بے زار ہوجاتا ہے۔

لہٰذا ہمیں ان اہل حق کا شکریہ ادا کرنا چاہیے جو اِس سوچ اور نظریے کے حامل ہیں کہ ہمیں ہر طرح کے الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا پر آنا ہوگا اور اُسے حقانی باتوں کے قیمتی جواہر سے مزین کرنا ہوگا اور یہ نظریہ اکابر علمائے کرام اور اَسلافِ امت کی سوچ اور فکر سے بالکل ہم آہنگ ہے۔موقع ملنے پر اِن شاء اللہ! دلائل اور حوالے بھی دے دیے جائیں گے۔

اگر ہم اس میں کام یاب نہ ہو پائے تو باطل کو کھلم کھلا اپنی بدمعاشی کا موقع ملے گا اور اہل حق دبتے چلے جائیں گے، بدنام ہوتے چلے جائیں گے۔ہمیں ان وسائل کو اِستعمال کرنا چاہیے جن سے ہمارا پیغام زیادہ سے زیادہ موثر بھی ہو، سنجیدہ طبقہ اسے قبول بھی کرے اور کثیر تعداد میں لوگوں تک پہنچ بھی جائے۔

اس کے لیے ایک بہت بڑا آلہ قلم ہے۔ویڈیو کی اہمیت ہر ایک کے دل میں نہیں اور تحریر میں جو فائدہ اور دیرپا اثر ہوتا ہے، وہ ویڈیو میں نہیں ہوتا۔

اس کے علاوہ ہمیں یہ بات سمجھنے کی بھی ضرورت ہے کہ تحریر وتقریر کی روح کیا ہے؟ ان کی روح ''اخلاص'' ہے۔

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے
پَر نہیں ، طاقت پرواز مگر رکھتی ہے

جب انسان دلی ہمدردی کے ساتھ امت کے غموں کو سہتے ہوئے قلم اٹھاتا ہے، وہ دلوں کو چیر کے رکھ دیتا ہے، کلیجوں کو پھاڑ کر رکھ دیتا۔ ہزاروں نہیں، لاکھوں کروڑوں لوگ اس کی آہ پر لبیک کہتے ہیں اور صدیاں بیت جانے کے بعد بھی اس کی تحریر تازہ دم نظر آتی ہے۔

دین داری خود جالبِ رزق ہے۔ اگر اِسلام کے بتائے ہوئے چند اَعمال اور اہل اسلام کے ہدایت کردہ چند مجربات اتنی تاثیر رکھ سکتے ہیں کہ ان کے ذریعے سے آدمی فقر و فاقہ کی تنگی سے نکل کر غنا و مال داری کی کشادگی میں قدم رکھ لیتا ہے تو مکمل دین داری اور اللہ کے دین کی خدمت کیوں یہ تاثیر نہ رکھتی ہوگی اور اللہ پاک اپنے دین کے خادم کو کیوں کر لاچار اور در دَر کا محتاج رکھیں گے، وہ تو اوروں کو بھی ایک در کی طرف لا رہا ہے، وہ کیوں در دَر کی ٹھوکریں کھائے گا۔

اکابر کی سوچ، اکابر کے نظریے اور اَکابر کے طرزِ فکر کو لے کر اِن شاء اللہ! جب ہم اس میدان میں قدم رکھیں گے اور یک سوئی سے خدمتِ دین میں لگ جائیں گے تو یہ مہارتیں ان شاء اللہ! ہمارے لیے خود جالب رزق بن جائیں گی اور ہمیں روزگار کے لیے کسی اور دروازے پر سَر جھکانے کی ہرگز ضرورت نہیں پڑے گی۔ کب بنیں گی، کیسے بنیں گی، اسے ہمیں اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دینا چاہیے اور خلوص اور لگن کے ساتھ اپنے کام میں لگ جانا چاہیے۔

بل کہ اگر اِسی میں ہم نے خود ہی روزگار کی طلب کو سامنے رکھا تو ہمارا یہ عمل، عمل مخلوط بن جائے گا۔ یہ فقہائے امت اسلامیہ کی اصطلاح ہے۔ اس کا مطلب ہے: وہ عمل جس میں دنیا اور دین، دونوں جہتوں کو سامنے رکھا جائے۔ اس کا حکم یہ ہے کہ اول تو اِس کا درجہ خالص عمل سے کم ہے، دوم یہ کہ اگر اِس عمل میں نیکی کا ارادہ زیادہ ہوگا پھر تو ثواب ملے گا، لیکن اگر نیکی اور دنیا، دونوں کا ارادہ برابر کا ہو تو پھر اُسے اس عمل کا ثواب نہیں ملے گا۔ جب ثواب ہی نہ ملا تو اُس عمل کی قبولیت کس درجے کی ہوگی اور اُس کا فائدہ امت کو کس قدر ہوگا؟ اس کا اندازہ ہمیں خود ہی لگا لینا چاہیے۔

اس تحریر کا مقصد طالبین علم و عمل کو زورِ قلم آزمانے، قلم کے وار سے حق کی دعوت کو عام کرنے اور باطل کی یلغار کا مقابلہ کرنے پر آمادہ کرنا ہے۔

اللہ پاک ہمیں اخلاص کے ساتھ اپنے دین کی خدمت کے لیے قبول فرمالے اور اپنی رضا والے کام ہم سے لے لے۔ آمین!

مطالعہ ومشاہدہ: زیرو پوائنٹ

مشہور کالم نگار جاوید چودھری صاحب سے ایک بڑی دنیا واقف ہے۔آپ پاکستان کے مایہ نازاور معروف کالم نگار ہیں۔

ان کے کالم اپنی جدت اور معلوماتی ہونے میں کوئی ثانی نہیں رکھتے۔وہ نوجوان نسل میں بے حد مقبول ہیں۔آپ ''زیرو پوائنٹ'' کے نام سے کالم لکھتے ہیں اورٹی وی پروگرام ''کل تک'' کے میزبان بھی ہیں۔

ان کے کالموں کے مجموعے ''زیرو پوائنٹ'' کے نام سے کتابی شکل میں بھی شائع ہوتے ہیں۔

بڑوں کے مشورے پر میں نے ''زیرو پوائنٹ'' کی پہلی جلد کا مطالعہ شروع کر دیا ہے۔یہ کالم معلوماتی ہونے کے ساتھ ساتھ سہل ممتنع کا نمونہ بھی ہیں۔بے شمار اعلیٰ تعبیرات، محاورات اور ضرب الامثال کوتحریر کے قلابے میں اس طرح ڈال دیتے ہیں کہ ہر کس و ناکس ان کی تحریر سے بآسانی مستفید ہوسکتا ہے۔

سب سے بڑی بات یہ ہے کہ آپ سالم العقیدہ، محب وطن اور شعائر اِسلام کی پاس داری کرتے ہیں اوراپنے قلم کے ذریعے بھرپوراَنداز سے اس بات کا ثبوت بھی دیتے ہیں۔

ابھی تک ان کے چار مضامین پڑھنے کا موقع ملا ہے:

۱۔ مجرم حاضر ہے	۳۔ ہم سب کوفی ہیں
۲۔ ہم وکھری ٹائپ کے بھکاری ہیں	۴۔ عورت

یہ چاروں مضامین پڑھنے کے قابل ہیں۔پہلا مضمون تو درحقیقت کتاب کا پیش لفظ ہے، جس

میں کالم نگار جاوید چودھری صاحب اپنا کچھ ماضی بتلاتے ہیں، پھر اپنی کتاب کو قارئین کی عدالت میں پیش کر دیتے ہیں اور اُن کے فیصلے کی نذر کر دیتے ہیں۔

دوسرا مضمون درحقیقت اربابِ اقتدار کے لیے راہ نما ہے۔ ان کی عملی کمزوریوں اور اُن کے نقصانات پر سے پردہ ہٹایا گیا ہے۔

تیسرے مضمون میں جہاں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شان بتلائی ہے اور تن تنہا حق کے سامنے کھڑے ہو جانے میں ان کا تاریخی کردار روشن کیا ہے، وہیں ایران سے مصر تک ۶۲ اِسلامی ممالک کے باطل پر خاموش رہ جانے اور غزہ میں مظلوم مسلمانوں کی مدد کے لیے ہاتھ نہ بڑھانے پر اَفسوس ظاہر کیا ہے۔ واقعی بہت عمدہ انداز سے موصوف نے امت مسلمہ کی اس بے حسی کو کوفے والوں کے کردار سے تشبیہ دی ہے اور اِنتہائی سنسنی خیز اَنداز سے قاری کو عنوان اور مضمون کی مناسبت سمجھائی ہے۔ اختتام تک پہنچنے سے پہلے اس گتھی کو نہیں سلجھایا جا سکتا۔

آخری مضمون کے بارے میں کیا عرض کروں، بس اتنا کہوں گا کہ رلا دینے والا مضمون ہے۔ نہ کوئی بدزبانی نہ کوئی الزام تراشی۔ مضمون کا آغاز بی بی فاطمہ رضی اللہ عنہا کے مقام کو بتلاتے ہوئے کیا۔

پھر ۸ مارچ عالمی حقوق نسواں میں عورتوں کے مطالبوں کا ذکر کیا۔ سلجھے ہوئے انداز سے مغربی معاشرے کی خامیوں پر سے پردہ ہٹایا اور ہمارے معاشرے میں موجود عورت کے مقام، یہاں تک کہ عام سڑک میں اور عوامی جگہوں میں اسے دی جانے والی عزت کو کھول کھول کر واضح کیا ہے۔

تاکہ امت مسلمہ کی خواتین جان سکیں اور یہ محسوس کر سکیں کہ وہ کتنی نعمتوں میں پل رہی ہیں اور وہ جس معاشرے کی طلب میں ہیں، وہ کس قدر ناعاقبت اندیش ہے۔

غرض تمام مضامین بہت عمدہ ہیں۔ انداز بھی نرالا ہے۔ ان سے کافی کچھ سیکھا جا سکتا ہے۔ واقعی یہ اس میدان کے بہترین شہ سوار اور تجربہ کار کھلاڑی ہیں۔

اناڑی سے لکھاری تک کا سفر

اس میں شک نہیں کہ دنیا رنگا رنگ اور قسما قسم کے لوگوں سے بھری ہوئی ہے۔ ہر کسی کا ایک میدان ہے، اس کا شغل ہے۔ اس کی ایک زندگی ہے، ایک جہاں ہے۔

ان میں بھی دو طرح کے لوگ ہوتے ہیں: ایک وہ ہیں جو سوچتے ہیں۔ دوسرے وہ ہیں جو شاید سوچتے ہی نہیں۔ ان کا وجود حقیقی دنیا میں شاید ہی ہو، البتہ تصورات میں موجود ہے۔

اور جو لوگ سوچتے ہیں، وہ بھی دو طرح کے ہیں۔ ایک وہ جو صرف اپنے کام کے متعلق سوچتے ہیں اور دوسرے وہ جو سب کا سوچتے ہیں۔

ایک لکھاری کا تعلق اس دوسری قسم کے لوگوں ہی سے ہے۔ یہ سارے جہاں کے بارے میں سوچتا ہے۔ ہر ایک کو پڑھتا ہے، سمجھتا ہے، جانچتا ہے۔ بہت گہری نگاہ ہوتی ہے اس کی۔

اور صرف یہی نہیں، بل کہ وہ ان مشاہدات پر، معلومات پر، احساسات پر قلم کا زور لگا کر رہتا ہے اور اُنھیں کاغذ کے سپرد کر کے ہی چین کا سانس لیتا ہے۔ اس سے یہ بات برداشت ہی نہیں ہوتی کہ میں ان احساسات کو اپنے اندر ہی سموئے ہوئے اس دنیا سے چلا جاؤں۔

لیکن کیا یہ لکھاری پہلے دن ہی سے لکھاری بن جاتا ہے؟ کیا وہ یہ ملکہ ماں کے پیٹ سے لے کر آتا ہے؟ کیا اس کی یہ تیر بہدف نگاہ اسے پیدائشی مل جاتی ہے؟ نہیں، ہرگز نہیں!

ایسا نہیں ہے کہ میں خداداد صلاحیتوں کا قائل نہیں ہوں، لیکن محنت بہر حال محنت ہے۔ اس کے بغیر تو عطا کردہ جوہر بھی کوئلہ بن جاتا ہے اور اِس کی بنا پر اناڑی بھی لکھاری بن جاتا ہے۔

میری اپنی مثال بھی کچھ ایسی ہی سمجھیے۔ ایک اناڑی جو کہ اس راہ پر اپنی طاقت اور وسعت کے

بقدر محنت کے لیے تیار ہوا ہے۔

چند باتیں جو اناڑی سے لکھاری کے اس سفر کو طے کرنے میں مرکزی کردار اَدا کرتی ہیں، قارئین کی نظر کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔ یہ جرأت مجھ میں یوں پیدا ہوئی کہ یہ باتیں مجھ ناکارہ کی نہیں ہیں، بڑوں کی باتوں سے مستفاد ہیں۔ ہاں، الفاظ اور تعبیرات میری اپنی ہیں، انھیں کہیں سے چرایا نہیں ہے!

ایک ہے مطالعہ، دوسرے نمبر پر ہے تنقیدی مطالعہ، تیسرے نمبر پر ہے عوامی طرز واُسلوب کا مطالعہ اور چوتھے نمبر پر ہے منتخب مطالعہ، پانچویں نمبر پر ہے لوگوں کا مطالعہ، چھٹے نمبر پر ہے احوال کا مطالعہ اور ساتویں نمبر پر ہے: بس مطالعہ، مطالعہ اور مطالعہ!

یہ ہے وہ مختصر اور جامع تقریر دل پذیر جو میں قارئین کی نظر کرنا چاہوں گا۔ پھر موقع ملا تو اِن ساتوں کے طریقہ کار، ان کی خصوصیات اور اِن سے حاصل ہونے والے فوائد وثمرات پر بھی بات کریں گے۔ اب مطالعے کا وقت ہوا چاہتا ہے، تب تک کے لیے اللہ حافظ۔ ملتے ہیں ڈھیر سارے مطالعے کا بعد۔

تمنائے دل

چلے ہو ساتھ تو ہمت نہ ہارنا واصف!
کہ منزلوں کا تصور میرے سفر میں نہیں ہے

انسان تو اِنسان ہے! اس کی طبیعت میں انفعال کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ یہ اثر قبول کرتا ہے، متاثر ہوتا ہے۔ سیکھتا ہے، پڑھتا ہے، لکھتا ہے، اپنا راستہ خود تراشتا ہے اور اُس پر چل پڑتا ہے۔ اس کے ہاتھ کی لکیریں وہی بتاتی ہیں جو وہ کرتا ہے اور اُس کے ستارے بھی اسی جانب گردش کرتے ہیں جس جانب وہ گردش کرتا ہے۔

میں بھی اس انفعالی کیفیت کا مالک ہوں۔ کہتے ہیں کہ چالیس سال تک انسان کے نظریات میں خاصی تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ اس کے بعد اُس کا ذہن پختہ ہو جاتا ہے اور جلدی اثر قبول نہیں کرتا۔

لکھنے لکھانے کے انداز، موضوعات، بیان کردہ افکار، سب میں وقت، زمانے اور ماحول کے پیشِ نظر فرق آیا ہے۔ مطالعے نے بھی اندازِ تحریر بدل دیا ہے۔ زندگی کے ہر سبق نے میرے لب و لہجے میں اثر پیدا کیا ہے۔ آنے والے ہر اُستاد نے میری تحریر میں ایک الگ روح پھونکی ہے۔ ہر سفر کے بعد میری تحریر کی دنیا نے ایک نیا روپ دھارا ہے۔

لیکن ان تمام باتوں میں ایک بات ہمیشہ مشترکہ طور پر موجود رہی ہے۔ اسے چاہیں تو آپ ان تمام ادوار میں ایک ''کامن فیکٹر'' کہیں یا کچھ اور کہیں۔ اور وہ ہے لکھنے کا ذوق!

مجھے میری بہنوں نے قلم پکڑایا تھا۔ تبھی سے لکھنے کا آغاز ہو چکا تھا۔ اسکول کی دنیا میں جب داخل ہوئے تو وہاں الگ رنگینیاں تھیں۔ وہاں حروف، الفاظ، جملے سب کچھ لکھنا شروع کر دیے، البتہ

مضمون کی باری اس وقت تک نہیں آئی تھی۔

پہلی جماعت میں نے جس اسکول میں پڑھی وہاں مجھ سے Myself (میرا تعارف) نامی مضمون لکھوایا گیا۔ یہ میری زندگی کا پہلا مضمون تھا۔ اس کا آغاز بھی میری ذات سے ہوا۔ وہ ذات جو روزِ اول سے میرے ساتھ منسلک ہے اور آخر تک منسلک رہے گی۔

شاید وہ پہلا مضمون ہی آئندہ کے تمام مضامین کی بنیاد بنا، پھر میں لکھتا گیا اور لکھتا ہی چلا گیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ لکھنے کے اس ذوق کو فطرت نے میرے اندر سمو کر مجھے وجود بخشا تھا یا اس پہلے مضمون نے اسے میرے اندر داخل کر دیا۔

البتہ میں نے اس سے مناسبت ہمیشہ محسوس کی ہے۔اس کی طرف ایک دلی میلان رہا ہے۔اسے اپنا پسندیدہ مشغلہ سمجھتا رہا ہوں اور اَب جا کر اِسے کچھ نا کچھ عبادت بھی سمجھنے لگا ہوں۔

اسکول کے دور میں انگریزی کا بھوت سر سے اترنے نہ پایا، لیکن اللہ پاک اردو کی استانیوں کو جزائے خیر دے اور جہاں بھی ہوں انھیں خوش باش رکھے، آباد رکھے۔منتخب ادبی تحریریں لا کر ہمیں دے دیتی تھیں۔مضمون نگاری کے لیے چند الفاظ اور محاورے بھی انتخاب کر کے عنایت کر دیتیں کہ انھیں استعمال کر کے مضمون لکھو اور ہمیں دکھاؤ۔ ویسے تو ہم پر کسی کا زور نہ چلتا تھا، لیکن یہ استانیاں بے انتہا محبت اور شفقت کے بل بوتے پر ہم سے کچھ نہ کچھ کام کروا ہی لیتی تھیں!

ایک فائدے کی بات بتلاتا چلوں۔ میں نے استانیوں کے اس انداز کو بہت ہی پسند کیا ہے۔ اس کے علاوہ اسکول یا مدرسے میں کہیں بھی اس انداز کو نہیں دیکھا۔ چاہے اردو ہو، انگریزی ہو، عربی ہو یا دنیا کی کوئی بھی زبان۔ اگر طلبہ کو چند الفاظ، چند تعبیرات اور چند محاورے دے دیے جائیں اور اُن سے کہہ دیا جائے کہ کم از کم ان میں سے ساٹھ یا ستر فی صد استعمال کرو اور اِن چند مضامین میں سے ایک مضمون لکھو، پھر اِنفرادی طور پر طلبہ کے مضمون پر نظرِ ثانی بھی کی جائے اور اُس پر تبصرہ بھی ہو، اس سے طلبہ بے انتہا مستفید ہوں گے۔ بجائے لغت رٹانے کے اور محلِ استعمال کے

تعین کے بغیر الفاظ معانی اور تعبیرات یاد کرانے کے یہ انداز زیادہ بہتر ہے۔اس سے طلبہ کی ذاتی صلاحیتوں میں بھی اضافہ ہوتا ہے، لکھنے کے ذوق میں بھی بڑھوتری ہوتی ہے، طالب علم الفاظ کے درست استعمال کو بھی سمجھ لیتا ہے اور کئی تعبیرات بھی اسے ذہن نشین ہو جاتی ہیں۔ ہاں، البتہ استاد اور شاگرد، دونوں کی محنت ضرور دو چند ہو جاتی ہے اور محنت ہی میں تو عظمت ہے۔

چلیں، اب دوبارہ اپنے مضمون کی طرف لوٹ آتے ہیں۔اس دور میں بھی میری زیادہ توجہ انگریزی پر ہی رہی اور ذاتی شوق کی بنا پر جو مضامین لکھے اور جنھیں خوب پذیرائی بھی حاصل ہوئی، وہ انگریزی ہی کے تھے۔

گیارہ سال سے اوپر کچھ عرصہ اسکول میں گزرا، پھر زندگی کے آٹھ خوش گوار سال مدرسے کی زندگی میں بتائے اور درسِ نظامی کورس مکمل کیا۔ یہ ہے ابھی تک کی تعلیمی زندگی کا خلاصہ۔ جب مدرسے میں آیا تو اُردو میں کافی دشواری ہوتی تھی۔ بولنا بھی مشکل لگتا تھا اور لکھنا بھی دشوار محسوس ہوتا تھا، البتہ بچپن کا وہ گوہر، پھر مدارس کا ماحول اور اَساتذہ و مشایخ کی توجہات ظاہر ہوئیں اور اُردو کے ساتھ ساتھ عربی میں بھی لکھنا شروع کر دیا۔ چوتھے درجے میں جا کر کچھ مضامین بھی شائع ہونے لگے۔ پانچویں درجے کے بعد ایک کتاب پر کام کرنا نصیب ہوا۔اس کے بعد اَب بھی کچھ لکھنا لکھانا ہو ہی جاتا ہے۔ اب الحمدللہ! اردو، عربی، انگریزی، تینوں زبانوں میں اس عاجز کے چند مضامین شائع ہو چکے ہیں۔

لیکن جہاں تک میں سمجھتا ہوں، ان کی اشاعت کی وجہ زبان کی شوخی اور اعلیٰ محاوروں کا استعمال نہیں ہے، وہ تو مجھے آتے ہی نہیں۔ شاید دردِ دل، آرزو اور جذبات ہی ان کی بے پناہ مقبولیت میں کارگر ثابت ہوئے ہوں گے۔ محض لکھنے کے شوق نے مجھے کبھی بھی لکھنے پر آمادہ نہیں کیا، بس جب بھی دل میں کوئی بات جاگزیں ہوئی یا کوئی خیال امنڈ آیا، جسے ظاہر کیے بغیر کوئی چارہ نظر نہ آیا، وہ بات مضمون کی شکل اختیار کر گئی۔

رہی بات منزل کی تو منزل تو میری کوئی نہیں ہے، البتہ مقصد ضرور ہے اور اِسی مقصد کی طرف

گام زن ہوں۔ وہ بنیادی مقصد رضائے الٰہی کا حصول ہے۔ اس کے چاہنے والوں میں شامل ہونا اور اُس کے عالی دین کی اشاعت میں اپنا حصہ ملانا میری زندگی کا حاصل ہے۔

ہاں، ایک راستہ ضرور طے کررہا ہوں اور اِسی راستے کو اپنے لیے انعام سمجھتا ہوں۔ اس پر واصف علی واصف کا وہ شعر بخوبی صادق آجاتا ہے، جس سے میں نے اپنے اس مضمون کا آغاز کیا۔

اسی ذوق کے پیشِ نظر ابھی ایک کورس میں شرکت کررہا ہوں۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ ایک اچھا لکھاری بن سکوں اور جس طرح جذبات کے نیک اور اچھے ہونے کو ضروری سمجھتا ہوں، اسی طرح الفاظ کے چناؤ اور تعبیرات میں بھی بہتری لاسکوں۔ نیز اپنی بات کو مفید تر بنانے کے لیے جن امور کا بجالانا ناگزیر ہو اُنھیں کرلوں اور جن قواعد وضوابط کا سیکھنا ضروری ہو اُنھیں سیکھ لوں۔ اسی طرح جن مرشدین کے ہاتھوں میں اپنا ہاتھ دینے کی سعادت مقدر ہو اُن کے ہاتھوں میں اپنا ہاتھ دے دوں، ان کے سامنے زانوئے تلمذ طے کرلوں اور اُن کی شاگردی کی دولت سے مالا مال ہوجاؤں۔

میری چند مصروفیات ایسی ہیں جو مجھے ابھی شاید زیادہ ادبی مطالعہ کرنے کا موقع نہ دے پائیں۔ فقہ اسلامی میں تخصص (اسپیشلائزیشن) کے باعث اس کی کتابوں میں وقت زیادہ صرف کرنا ضروری سمجھتا ہوں، البتہ لکھنے سے میرا رشتہ اور زیادہ بڑھنے والا ہے۔ اب صرف مضامین ہی نہیں، بل کہ فتاویٰ بھی لکھنے ہوں گے۔

میری آرزو یہ ہے کہ میں کم وقت دے کر بھی زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کرسکوں اور ہر طرح کی عام فہم علمی واَدبی تحریر کو لکھنے پر بخوبی قدرت حاصل کرسکوں۔ میری تحریر اِس پائے کی ہو کہ ہر خاص وعام اس کی تعریف کرنے اور اُسے قبول کرنے پر مجبور ہو۔

تمنائے دل بس یہی ہے کہ بڑوں کا سایہ اور اُن کی شفقتیں ہم پر برقرار رہیں، جو کہ صرف اس مقام تک پہنچنے میں ہماری معاون ثابت نہ ہوں، بل کہ ہماری دنیا وآخرت کی زندگی سنوارنے اور ہماری نجات کا ذریعہ بھی بنیں۔ آمین!

ہماری جیت

گھر میں گزرتے ان ایام میں جب کہ کرونا وائرس پوری دنیا پر براجمان ہے اور دنیا کی سب سے بڑی حکومت بنا بیٹھا ہے۔ نظر نہ آنے والی اس مخلوق نے سارے عالم کو اپنا تابع بنا دیا ہے۔ تقریباً روزانہ اکثر ہی گھروں میں اس کے متعلق کوئی نہ کوئی گفتگو ضرور ہوتی ہے۔

نت نئے بیانات، جدید ترین تحقیقات اور ہر دِن بڑھتے اعداد و شمار، مختلف آرا کا ٹکراؤ، یہ سب ہی انسانی دماغ کو مصروف کیے ہوئے ہیں۔ کچھ باتیں امید پیدا کرتی ہیں اور کچھ باتوں سے خوف کی فضا پھیل جاتی ہے۔

مستقبل میں کیا ہوگا؟ کرونا کب تک رہے گا؟ اس کے بعد کی زندگی کیسی ہوگی؟ سچ بات تو یہ ہے کہ بڑے سے بڑا آدمی بھی اس بات کا صحیح اندازہ نہیں لگا سکتا۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنا زاویۂ فکر بدل کر دیکھیں۔ ہمارا ماضی ہمارے ہاتھوں سے نکل چکا ہے، مستقبل ہاتھ آیا نہیں ہے اور جس پر ہمارا مکمل اختیار ہے، وہ زمانہ حال ہے۔ زمانہ حال ہی ہمارے مستقبل کا تعین کرے گا اور ہمارے ماضی کی کتاب بھی یہی زمانہ بنے گا۔

تو کیوں نہ ہم سب اس زمانے کو سنوارنے کی کوشش کریں اور سوچیں کہ یہ ہمارے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟ کیوں ہو رہا ہے؟ کیسے ہو رہا ہے؟ اور ہمیں اس وقت کیا کرنا چاہیے۔

تھوڑا تاریخ کے دریچے کھولنے کی دیر ہے، ذرا نظامِ خداوندی پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ جہان والوں کے لیے راہ نما بنائی گئی اور قیامت تک باقی رہنے والی یہ عالی شان کتاب قرآن مجید اِس موقع پر بھی ہمیں مایوس نہیں کرے گی۔ ہمارے سارے سوالات بھی حل ہو جائیں گے، حال

بھی سنور جائے گا اور مستقبل کا تعین بھی ہو جائے گا۔

ہمارا اِیمان ہے کہ کافروں پر آنے والی مصیبت عذاب ہوتی ہے اور اُنھیں مرنے سے پہلے اللہ پاک کی طرف متوجہ کرنے کا ذریعہ بنتی ہے، جب کہ ایمان والوں کے لیے یہ مصیبت درحقیقت آزمائش ہوتی ہے۔ اب ہماری جیت اس بات میں ہے کہ ہم اس آزمائش میں سچے ثابت ہوں۔

اللہ پاک سورۂ عنکبوت میں فرماتے ہیں:

اَحَسِبَ النَّاسُ اَنۡ یُّتۡرَکُوۡۤا اَنۡ یَّقُوۡلُوۡۤا اٰمَنَّا وَ هُمۡ لَا یُفۡتَنُوۡنَ ۞ وَ لَقَدۡ فَتَنَّا الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ فَلَیَعۡلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِیۡنَ صَدَقُوۡا وَ لَیَعۡلَمَنَّ الۡکٰذِبِیۡنَ ۞

(سورۃ العنکبوت:۲،۳)

ترجمہ: ’’کیا لوگوں نے یہ خیال کر رکھا ہے کہ انھیں یہ کہنے کے بعد کہ ہم ایمان لے آئے، آزمایا نہیں جائے گا اور ایسے ہی اپنی حالت پر چھوڑ دیا جائے گا۔ یقیناً ہم نے ان سے پہلے لوگوں کو بھی آزمایا تھا۔ اللہ پاک یہ جان کر (اور دکھا کر) رہے گا کہ ان میں سچے کون ہیں اور جھوٹے کون ہیں۔‘‘

اب اگلا سوال یہ ہے کہ ہم اس آزمائش میں سچے کیسے ثابت ہوں؟ وہ کیا باتیں ہیں جو اللہ پاک ہمیں اپنی اس مخلوق کرونا کے ذریعے سے دکھانا چاہتے ہیں اور وہ کون سے امور ہیں جن کا ہمیں پابند بنانا چاہتے ہیں۔

ہمیں سوچنا ہوگا، غور کرنا ہوگا کہ اگر ہم کرونا سے ڈر سکتے ہیں تو ہم گناہوں سے کیوں نہیں ڈر سکتے؟ اگر ہمیں اس بیماری کی ہولناکیوں سے ڈر لگتا ہے، تو ہمیں گناہوں کے بُرے انجام سے ڈر کیوں نہیں لگتا؟ اگر ہم دن رات اللہ کی اس مخلوق کا تذکرہ کر سکتے ہیں تو اِس کے خالق کا ذکر کیوں نہیں کر سکتے؟ جس طرح کرونا اپنوں سے دوری کا باعث بن سکتا ہے، گناہ بھی انسان کو اپنوں سے

دور کر دیتا ہے۔ پَل بھر کی لذت کی خاطر ہمیشہ کے کرب و تکلیف کا سودا کوئی معمولی سودا تو نہیں ہے۔ گناہ تو ہمیں اپنے سب سے قریب، سب سے زیادہ وفادار اور چاہنے والے رب سے بھی دور کر دیتا ہے۔ اس کے آگے رونے، گڑگڑانے، سربسجود ہونے کی نعمت بھی ہم سے چھین لیتا ہے۔ ایمان کی حلاوت بھی ہم سے سلب کر لی جاتی ہے۔

اگر کرونا ہم سے پردہ کروا سکتا ہے، نقاب کروا سکتا ہے تو اللہ کا ڈر، اس کی محبت آخر کیوں اتنی کمزور پڑ گئی ہے کہ وہ ہم سے حجاب نہیں کروا سکتی۔ جس طرح ہم کرونا میں یہ نہیں دیکھتے کہ لوگ کیا کہیں گے، ہم اچھے لگ رہے ہیں ہیں یا بُرے، جذبات کے بجائے عقل سے فیصلہ کرتے ہیں اور اِس سے بڑھ کر یہ کہ ڈاکٹر کی ماننے میں عافیت سمجھتے ہیں، آخر پردے کے معاملے میں ہم اچھے بُرے لگنے یا لوگوں کی باتوں کی کیوں پروا کرتے ہیں۔ کیا اتنی بات کافی نہیں کہ اللہ کا حکم ہے اور نبی کا فرمان ہے۔ جب کائنات کی سب سے پاکیزہ ہستیوں کو سب سے پاکیزہ مردوں سے بھی پردے کا حکم اللہ پاک دے رہے ہیں تو ہم کیوں پردے کی نعمت سے اپنے آپ کو محروم رکھتے ہیں؟

اگر کرونا ہمیں گھر بٹھا سکتا ہے، بُری صحبت، بُرے ماحول سے بچا سکتا ہے، راستوں میں، بازار میں بیٹھے رہنے سے ہمیں بچا سکتا ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشادات کی بھی ہمارے اندر اتنی اہمیت ہونی چاہیے کہ وہ ہماری زندگی سیدھی راہ پر گامزن کر سکیں۔

اگر کرونا ہمیں گھر میں وقت دینے، گھر آباد کرنے، گھر کو اَعمال سے زندہ رکھنے پر آمادہ کر سکتا ہے، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی ہمارے لیے نمونہ حیات کیوں نہیں بن سکتی؟

اگر کرونا ہمیں اذان، نماز، تسبیح کا پابند بنا سکتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی محبت ہمیں اس کے ذکر پر کیوں نہیں اکسا سکتی؟

یہ کرونا ہم سے ہاتھ دھلواتا ہے، سینیٹائزر استعمال کروا سکتا ہے، ہمیں صفائی ستھرائی کا خیال رکھنے پر مجبور کرتا ہے تو کیا اسلامی تعلیمات ہمیں ان باتوں پر عمل کرنے پر آمادہ نہیں کر سکتیں؟ اسلام

نے تو صفائی کو دین کا حصہ قرار دیا گیا ہے؟ موقع بموقع وضو، غسل، ہاتھوں کے دھونے جیسے مبارک احکامات ارشاد فرمائے ہیں۔

اگر کرونا کی وجہ سے کفار کے دل نرم ہو سکتے ہیں، وہ غریبوں، ہم سایوں، ملازمین پر اَربوں کھربوں لٹا سکتے ہیں، آناً فاناً علاج معالجے کی ترتیب بنا سکتے ہیں، احتیاطی تدابیر کے آلات مہیا کر سکتے ہیں، اپنے ساتھ دیگر اقوام وممالک کا ہاتھ بٹا سکتے ہیں، ان کے ساتھ بلاعوض تعاون کر سکتے ہیں تو کیا ہمارے مسلمان بھائیوں کو اللہ پاک نے دولت نہیں دی؟ کیا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ ارشاد ہمارے لیے کافی نہیں: تمام مال دار ہلاکت میں ہیں، سوائے ان مال داروں کے جو دائیں بائیں، آگے پیچھے، ہر طرف پیسا بہائیں۔'' کیا سورۂ قلم کا واقعہ، متعدد احادیث مبارکہ، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا طرزِ عمل ہمارے لیے مثال نہیں!؟ صحابہ رضی اللہ عنہم آپس میں جہاں اور نیکیوں میں مقابلہ کرتے تھے وہاں اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرنے میں بھی مقابلہ ہوتا تھا۔ کیا بات ہے کہ غیر مسلم اس مقابلے میں ہم سے بازی لے جا رہے ہیں؟ کیا یہ حیرت وافسردگی کا مقام نہیں ہے؟

پہلے لوگ جینے کے لیے کماتے تھے، اب لوگوں نے زندگی کی خاطر کمانا چھوڑ دیا ہے۔ معلوم ہوا کہ انسان بغیر کمائے بھی رہ سکتا ہے۔ کیا کچھ عرصے اللہ تعالیٰ کے دین کی تبلیغ کی خاطر بھی ہم کمانا نہیں چھوڑ سکتے؟ اس زندگی کی مہلت تو بہت کم ہے اور آنے والی زندگی ہمیشہ کی زندگی ہے۔ ہمیں وہاں کے لیے بھی تو کمانا ہوگا۔

اسی طرح ہمیں سوچنا چاہیے کہ اگر جان بچانے کے لیے پندرہ دن دکانیں بند ہو سکتی ہیں، فیکٹریوں پر تالا لگ سکتا ہے، تو نماز کے لیے پندرہ منٹ دکان بند کرنا بھی مشکل نہیں ہے۔

سورۂ اعراف میں اللہ پاک فرعون کی قوم کا تذکرہ فرماتے ہیں۔ سمندر میں غرق کیے جانے سے قبل اس قوم پر پانچ سے بھی زیادہ طرح کے عذاب آئے۔

ان میں طوفان کی تیزی سے ایک وبا پھیلی اور لوگ بکثرت مرنے لگے۔ ان پر ایک کے بعد ایک مخلوق آسمان سے برسائی گئی۔ ٹڈیاں، جوئیں، مینڈک۔ ان خدائی افواج نے ان کا جینا مشکل کر دیا، پھر خون کے عذاب کے ذریعے انھیں آزمایا گیا۔ جب بھی پانی پینے لگتے یا اسے برتن میں ہی ڈالتے، وہ پانی خون بن جاتا تھا۔

ہر مرتبہ قوم نے حضرت موسی علیہ السلام سے وعدہ کیا کہ اس عذاب کو ہم سے ہٹوایئے، ہم نیک ہو جائیں گے، ایمان لے آئیں گے، آپ کی قوم بنی اسرائیل کو چھوڑ دیں گے، لیکن جب بھی ان پر سے عذاب ٹلا، یہ قوم دوبارہ اپنی بُری طبیعت کی طرف لوٹ آئی اور کفر سے باز نہ آئی۔

کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم بھی اسی قوم کے نقش قدم پر چل پڑیں اور اپنی بُری عادتوں کی طرف لوٹ آئیں۔ اللہ تعالی کے پاس کرونا سے بڑھ کر بھی افواج موجود ہیں اور ہم سے پہلی قوموں پر اس سے بڑھ کر مصیبتیں آچکی ہیں۔

یہ وائرس اور اِس کی ہلاکتیں ہماری عبرت کے لیے کافی ہو جانی چاہییں۔ اب ہمیں اپنی زندگی کو ایک الگ زاویے سے دیکھنا ہوگا۔ اپنا طرزِ زندگی بدلنا ہوگا، اپنی سوچ میں بہتری لانا ہوگی۔ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع میں اضافہ کرنا ہوگا۔ ایمان و اعمال کی محنت میں لگنا ہوگا۔ اسلامی تعلیمات کو سیکھنا ہوگا اور اُن کے مطابق عمل کرنا ہوگا۔ یہ ہے اس وائرس کا ہم سے چھوٹا سا مطالبہ۔ امید ہے کہ ہم اس مطالبے کو پورا کریں گے۔

اب بھی وقت ہے۔ یہ قوم آج بھی عروج پا سکتی ہے۔ روٹھے رب کو منانے کی دیر ہے، وہ ماننے میں دیر نہیں کرتا، لیکن ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم سچی توبہ کریں، آئندہ زندگی کو بدل دینے کا پختہ عزم کریں۔ اس معاملے کو سنجیدگی سے لیں، اس آزمائش کو اپنے آپ سے مخاطب سمجھیں اور اِس کے پیغام کو کان لگا کر سنیں۔

ہمیں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ کرونا اللہ تعالی کی مخلوق ہے۔ کفار بھی اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں۔

امریکا، اسرائیل کے لوگ بھی اللہ تعالیٰ ہی کی مخلوق ہیں۔ یہودی، عیسائی سب اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں، اللہ تعالیٰ کے حکم کے تابع ہیں۔ خالق کی اجازت کے بغیر ایک پنکھ نہیں مار سکتے۔ ہمیں خالق کو راضی کرنا ہوگا۔ وہ سب کام بنا دے گا، خوشیوں سے ہماری جھولیاں بھر دے گا۔ بس اس بات کی دیر ہے کہ ہم اپنے خالق سے سچی توبہ کریں، اس پر اِعتماد کریں اور سچے دل سے اس کی طرف رجوع کرلیں۔ اسی میں ہماری جیت ہے اور اِسی میں ہماری کامیابی ہے۔

اِنِّیْ تَوَکَّلْتُ عَلَی اللّٰہِ رَبِّیْ وَ رَبِّکُمْ ؕ مَا مِنْ دَآبَّۃٍ اِلَّا ہُوَ اٰخِذٌۢ بِنَاصِیَتِہَا ؕ اِنَّ رَبِّیْ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ﴿۵۶﴾ (سورۃ الھود)

ترجمہ: میں نے اللہ تعالیٰ پر بھروسا کیا جو میرا اور تمھارا رب ہے۔ کوئی چلنے والی مخلوق ایسی نہیں جو اُس کے قبضہ قدرت میں نہ ہو۔ بے شک میرا رب سیدھے راستے پر ملتا ہے۔

ہم کثیف ہر خطا ہیں ، سر بسر گندے ہیں ہم
اے لطیف و خالق و مالک! تیرے بندے ہیں ہم

انسان ان مول ہے

یقیناً انسان اس کائنات کا دولھا ہے۔ اسے وہ نعمتیں حاصل ہیں، اس میں وہ صلاحیتیں موجود ہیں اور یہ ایسی قوتوں کا مالک ہے جن کا تصور صرف انسان ہی میں کیا جاسکتا ہے اور اُن کی مثال دنیا کی کسی بھی دوسری شے میں نہیں پائی جاسکتی۔

مٹی کے اس مجسمے میں جب روح پھونک دی جاتی ہے تو یہ بہت کارآمد بن جاتا ہے۔ اس سے پھر ایسے کارنامے سرزد ہونے لگتے ہیں جن سے عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ پوری دنیا کو مٹھی میں لینے کی صلاحیت، ہر چیز کی تہ میں جانے کا گُر اور دنیا میں موجود اَشیا کی خصوصیات سمجھنا، اس کے ہی کمالات ہیں۔

اور اِس سے بڑھ کر اِعزاز کی بات کیا ہوگی کہ فرشتوں جیسی پاک باز، فرماں بردار اور اِطاعت گزار مخلوق نے، اور ایک نہیں، تمام کے تمام فرشتوں نے ایک ہی وقت میں اس کے دادا آدم علیہ السلام کے آگے سجدہ کیا اور اُن کی بھرپور تعظیم کی۔

صرف یہی نہیں، بل کہ ساری کائنات کو اُس کی خدمت میں لگا دیا گیا ہے۔ چرند، پرند، جانور، حشرات، چاند، سورج، ہوائیں، پانی، ہر چیز اِس کی خادم ہے اور اِس کی خاطر اپنے نظام میں رواں دواں ہے۔

آسمانوں میں موجود لوحِ محفوظ میں اس کے متعلق معلومات محفوظ ہیں۔ اس کی پیدائش سے بھی لاکھوں کھربوں سالوں پہلے اس کی زندگی کے متعلق ہر بات پہلے سے درج کی جاچکی ہے۔ فرشتے روزانہ اس کی روزی لے کر آسمان سے اترتے ہیں اور روزانہ اس کے اعمال کی فائل آسمانوں میں

لے جائی جاتی ہے اور اللہ رب العزت کے روبرو پیش ہوتی ہے۔ اس پر تبصرہ ہوتا ہے، اس کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ خود فخریہ طور پر اپنی بعض مخلوق کا تذکرہ فرشتوں کے سامنے کرتے ہیں اور اِس کے لیے کوئی نبی یا پیغمبر ہونے کی ضرورت نہیں۔ ذرا سی محنت کے ذریعے عام مسلمان بندے کو بھی یہ اعزاز حاصل ہو سکتا ہے۔

ہماری رسائی اگرچہ بادشاہوں تک تو نہیں ہے، لیکن بادشاہوں کے بادشاہوں تک ہم ضرور پہنچے ہوئے ہیں۔ وہ ہمیں دیکھتا بھی ہے، ہماری سنتا بھی ہے اور ہم سے زیادہ ہماری فکر کرتا ہے۔

کار ساز ما بہ فکر کار ما
فکر ما در کار ما آزار ما

صوفیائے کرام کی صحبت بھی انسان کو کہاں سے کہاں پہنچا دیتی ہے۔ ان کی ہر بات میں عجیب تاثیر ہوتی ہے۔ یہ لوگ عالمِ اسلام کا عظیم ترین سرمایہ ہیں۔ زندگی کی حقیقت کھول کر رکھ دیتے ہیں، انسان کو رب سے ملا دیتے ہیں اور اُس کی ہر تکلیف اور پریشانی کو چند لمحوں میں دور کر دیتے ہیں۔

صوفیائے کرام کا یہ فارسی زبان میں شعر ہے۔ اس کا ترجمہ ہے:

''میرا رب میرے کام بنانے والا، میرے کاموں کی فکر میں لگا ہوا ہے، میرا اپنے کاموں کے متعلق سوچنا بھی خواہ مخواہ خود کو تکلیف دینا ہے۔''

سبحان اللہ! کیا شان ہے ہمارے رب کی!

اور یہ سب کچھ اللہ پاک اس لیے نہیں کرتے کہ انھیں ہم سے کچھ توقع ہے یا ان کا ہم سے کوئی مفاد وابستہ ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ اس نے ہمیں پیدا کیا ہے۔ وہ ہمیں چاہتا ہے، ہم سے محبت کرتا ہے۔ وہ ہمیشہ ہماری بھلائی دیکھنا چاہتا ہے اور ہماری ترقی میں ہی اس کی خوشی ہے۔

اسی لیے تو وہ ہمیں کہتا ہے کہ مجھ سے مانگو جو مانگنا ہے اور ہمیں ہمارے وہم و گمان سے بڑھ کر عطا بھی کرتا ہے اور کبھی مانگنے پر خفا بھی نہیں ہوتا، بل کہ خوش ہوتا ہے اور نہ مانگنے پر ناراض ہوتا ہے۔

جب ہمیں اس دنیا میں اللہ پاک نے بھیجا ہے تو ہمیں یہاں بہت کچھ سیکھنا بھی ہوگا، جاننا بھی ہوگا، کرنا بھی ہوگا اور کئی باتوں کو سمجھنا بھی ہمارے لیے ضروری ہے۔

ان ہی باتوں میں سے ایک بات محبت ہے۔ محبت دراصل نام ہے کسی شخص یا کسی چیز کی طرف دل کے میلان کا۔ یہ کوئی بُری بات نہیں ہے، بل کہ ساری دنیا کا نظام اسی کی بنیاد پر چل رہا ہے اور اِنسان کے مختلف جذبات، چاہے وہ شفقت و ہمدردی کے کیوں نہ ہوں، اسی کی شاخیں ہیں۔ چھوٹا سا بچہ بھی اس کیفیت کو محسوس کرتا ہے اور بوڑھے سے بوڑھا شخص بھی اس سے باخبر ہو جاتا ہے۔

البتہ یہ قاعدہ اور ضابطہ ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ محبت میں رقابت ہوتی ہے۔ محبوب ہرگز یہ برداشت نہیں کرتا کہ میرا چاہنے والا میرے علاوہ کسی اور کو بھی چاہے یا کسی اور کو بھی اپنے دل میں جگہ دے۔

اور یہ ضابطہ صرف لوگوں کے درمیان نہیں ہے، بل کہ اللہ رب العزت کا بھی اپنی مخلوق کے ساتھ یہی معاملہ ہے۔ اللہ پاک یہ نہیں چاہتے کہ میرا بندہ مجھے چھوڑ کر کسی اور کو چاہے، کسی اور سے آرزوئیں باندھے، امیدیں وابستہ کرے، کسی اور سے اپنا دل لگا بیٹھے۔ انھیں ہرگز یہ نہیں پسند کہ میرا یہ بندہ دنیا کی محبت میں اتنا آگے نکل جائے کہ اسے آخرت یاد ہی نہ رہے، اسے میں یاد ہی نہ رہوں۔ وہ تو چاہتے ہیں کہ دنیا ہاتھ میں رہے اور دل میں، میں بسوں۔

اسی بنا پر اللہ پاک اپنے بندوں کو آزمائش میں رکھتے ہیں اور جو جتنا نیک ہوتا ہے، ان کے جتنا قریب ہوتا ہے، اسے اتنا ہی آزماتے ہیں۔ یہ سب اسی لیے ہے تاکہ وہ مجھ ہی سے دل لگائے رکھے، میری ہی طرف رجوع کرے، ہر آرزو، ہر توقع مجھ ہی سے قائم کرے۔

ان ساری باتوں کو بیان کرنے میں میرا مقصد یہی ہے کہ ایک تو اِنسان کو دنیا کی رنگینیوں میں مست ہو کر اللہ تعالیٰ کو بھلانا نہیں چاہیے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اتنی نعمتوں کے درمیان گنتی کے چند مسائل اور پریشانیوں کی وجہ سے گھبرانا نہیں چاہیے، ناامیدی کی چادر نہیں اوڑھ لینی چاہیے۔

امید کی کرن کی طرف بڑھنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی طرف متوجہ ہونا چاہیے۔ اس کی رحمت کی آغوش میں جگہ بنانے کی فکر کرنی چاہیے اور یہ خیال کرنا چاہیے کہ مجھ پر یہ آزمائش بھی اسی لیے ہے تاکہ میں اللہ پاک کی طرف متوجہ رہ سکوں، اس کی بارگاہِ عالی میں حاضری دیتا رہوں۔

انسان جس چیز کی کمی محسوس کررہا ہو، اگر وہ وہی بانٹنا شروع کردے تو اللہ پاک اسے وافر مقدار میں وہ چیز عنایت کردیتے ہیں، کیوں کہ وہ سخی داتا ہے، اس سے زیادہ کوئی سخی نہیں۔ جب دوسرا سخی بنتا ہے، اللہ پاک اس سے زیادہ اس پر سخی اور مہربان ہوجاتا ہے۔

لہٰذا اِنسان کو چاہیے کہ اگر مال میں کمی ہے تو جتنا مال ہے اس میں سے اللہ تعالیٰ کی راہ میں دینا شروع کردے۔ اگر زندگی میں غم زیادہ ہیں تو خوشیاں باٹنا شروع کردے۔ وہ بھی خوش رہنے لگے گا۔ کسی غریب کے چہرے پر مسکراہٹ لے آئے۔ کسی بزرگ کی دعائیں لے لے۔ اپنے استادوں کی جاکر دعائیں لے لے۔ اپنے خاندان والوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرلے۔

اگر محبت میں کمی دیکھتا ہے تو محبتیں باٹنا شروع کردے۔ اگر عزت و اِحترام کی کمی دیکھتا ہے تو اوروں کی عزت، ان کا احترام شروع کردے۔ جب اللہ پاک دیکھ لیں گے کہ یہ بندہ ہر بات پر میری طرف متوجہ ہوتا ہے اور زیادہ مال و دولت، زیادہ عزت و شہرت اسے مجھ سے غافل نہیں کرے گی تو اللہ پاک اس پر اپنی ان نعمتوں کے دروازے کھول دیتا ہے۔

ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ اللہ پاک کی فیاضی ہم سے کئی گنا زیادہ ہے۔ وہ ہم سے بھی زیادہ مہربان اور چاہنے والا ہے اور اُس کا خزانہ بھی لامحدود ہے۔

ہمیں یہ یقین بھی رکھنا چاہیے کہ جب تک ہمارا رب ہمارے ساتھ ہے، ہمارے لیے وہی کافی ہے۔ جب تک ہم اس کے ہیں وہ ہمارا ہے۔ وہی ہمارا بہترین کارساز ہے اور اُس کے یہاں آس ہے، یاس نہیں، جب کہ شیطان مردود کے یہاں یاس ہے، آس نہیں۔ یاس درحقیقت عربی میں نااُمیدی کو کہتے ہیں اور آس، امید کا نام ہے۔

کلام پاک میں اللہ تعالیٰ بار بار شیطان کے اس مکر وفریب کو بیان کرتے ہیں۔ وہ انسان میں ناامیدی پیدا کرتا ہے، اسے فقر و فاقے سے ڈراتا ہے، معمولی سی بات کو بڑھا چڑھا کر اُس کے سامنے پیش کرتا ہے اور اُسے پریشانی اور طرح طرح کی روحانی اور جسمانی بیماریوں میں مبتلا کر کے چھوڑ دیتا ہے۔ سورۂ اعراف میں مذکور ہے کہ اس نے انسان کے دائیں بائیں، آگے پیچھے، ہر طرف سے اس پر حملہ کرنے کی ٹھان لی ہے، جب کہ اللہ پاک سورۂ الم نشرح میں ہر مشکل کے ساتھ ایک نہیں، دو دو آسانیوں کا وعدہ کر چکے ہیں۔

اگر میں کسی کو ایک سفید رنگ کا خالی صفحہ دے دوں اور اُس پر ایک کالے رنگ کا دھبا ہو، پھر میں اسے اس صفحے پر غور کرنے کا کہوں تو تجربے سے ثابت ہے کہ وہ پورے سفید کاغذ میں اس کالے دھبے پر ہی غور کرے گا اور پھر جو کچھ کہے گا یا لکھے گا، اسی کے متعلق ہوگا۔ پورے صفحے میں اس کی نگاہ ایک منفی اثر کی طرف ہی جاتی ہے اور جو کچھ اس سفید ورق میں مثبت پایا جاتا ہے، وہ اسے نہیں دیکھ پاتا۔ اسی طرح اگر کسی آئینے پر دھبا ہو، تو وہ آئینے سے زیادہ اس دھبے کو ہی دیکھتا ہے۔

شیطان بھی ہمیں زندگی میں حاصل بے شمار نعمتوں کو چھوڑ کر گنتی کی چند پریشانیوں میں غور کرنے پر اُبھارتا ہے۔ اس کے برعکس اللہ پاک ہمیں مسلسل امید دلاتے رہتے ہیں، اپنی نعمتیں گنواتے ہیں، دنیا کی زندگی کے دھوکا ہونے کو بیان کرتے ہیں اور اپنی طرف اور آخرت کی زندگی کی طرف متوجہ ہونے کی دعوت دیتے ہیں۔ انبیا علیہم السلام کے قصے بیان کرتے ہیں، دیگر اَقوام اور اُن کے حالات بتلاتے ہیں۔

ہم اب اللہ والوں کا تذکرہ کر رہے ہیں۔ اللہ کو چاہنے والے لوگ، اللہ سے محبت کرنے والے حضرت ایوب علیہ السلام کی مثال قائم کرتے ہیں، جن میں صبر و شکر بے مثال تھے۔ مال و دولت، بیوی بچے، خاندان سب کچھ چلے جانے کے باوجود اُف نہیں کہتے اور اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ رہتے ہیں۔ جب وہ اللہ پاک کی طرف سے آئے اس امتحان میں کام یاب ہو جاتے ہیں تو اللہ پاک انھیں پہلے

سے بڑھ کر مال وعزت اور پہلے سے بڑا خاندان عطا کر دیتے ہیں۔ یہی تو ہے اللہ والوں کا شیوہ، نعمتوں پر شکر اور مصیبتوں پر صبر۔

آخر پھر ہم کیوں رحمٰن کی ان نعمتوں کو جھٹلاتے ہیں اور اُس کی طرف متوجہ نہیں ہوتے۔ اگر ہم اخلاص کے ساتھ اس سے تعلق جوڑ لیں اور غمی خوشی، ہر موقع پر اُسے یاد رکھیں، وہ ہمارے دلوں میں موجود غموں کو دور کر دے گا اور ہمیں وہ لازوال دولت عطا کرے گا جو ہمارے وہم وگمان میں بھی نہ ہو گی۔

بڑا دِل

علی اور احمد دو دوست تھے۔ ہمیشہ ایک دوسرے کا ادب و اِحترام کرتے۔ ایک دوسرے کی عزت کرتے۔ آپس میں محبت والفت تھی اور بے پناہ ایک دوسرے پر اِعتماد تھا۔ دونوں ایک ہی اسکول میں تعلیم حاصل کرتے تھے اور اچھے دوست تھے۔

پھر اللہ کا کرنا یہ ہوا کہ علی کے بھائی حامد نے بھی اسی اسکول میں داخلہ لے لیا۔ انتہائی نیک، شریف الطبع انسان تھا۔ عمر کم تھی اور اِبتدائی جماعت میں زیر تعلیم تھا۔

علی کا دوست احمد بھی کوئی بُرا لڑکا نہ تھا۔ نیک سیرت، خوش اخلاق، دوستوں کا قدر دان، استادوں کا ادب کرنے والا ایک پیارا اور ہر دِل عزیز طالب علم تھا۔

لیکن ایک مرتبہ......

احمد نے سوچا کہ اب تو علی کا بھائی بھی آیا ہوا ہے، کیوں نہ میں انھیں ایک بزرگ سے ملانے لے جاؤں اور واپسی میں ان کا بھرپور اِکرام بھی کروں۔

دونوں بھائی تیار ہو گئے اور احمد کے ساتھ روانہ ہوئے۔ حامد کچھ شکی مزاج کا حامل تھا اور شاید وہ دنیا میں کامل ترین لوگوں کی تلاش میں رہتا تھا۔ جب بھی اسے کسی میں ذرہ برابر کمی نظر آتی اسے بالکل چھوڑ دیتا تھا۔ اس مزاج کا ایک فائدہ جو میں سمجھتا ہوں، یہ ضرور ہے کہ انسان غلط دوستوں سے اور بُری صحبت سے محفوظ رہتا ہے، البتہ اس کا ایک نقصان یہ ہے کہ ایسے آدمی کا کوئی دوست نہیں رہتا۔ اسی وجہ سے حامد کا بھی کبھی کوئی دوست نہ بن پایا تھا۔

بہرحال، احمد، اس کا دوست علی اور علی کا بھائی حامد، تینوں روانہ ہو گئے۔ بزرگ سے ملے، کچھ

کھایا پیا اور واپس آ گئے۔ علی بہت ہی بھولا بھالا تھا اور حامد اِنتہائی حساس اور شکی مزاج کا حامل۔ ان کے اس مختصر سے دورے میں حامد نے احمد کے اندر کوئی خامی دیکھی، جو اُس سے برداشت نہ ہوئی۔

پھر حامد نے علی کی ذہن سازی کرنا شروع کر دی اور اُسے احمد سے دور ہونے پر آمادہ کرنے لگا۔ پہلے تو علی اس کی بات کو ٹالتا رہا، لیکن آخر کار اُس کی باتوں میں آ کر علی نے احمد سے دوستی ختم کر دی۔ اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ اب جب بھی احمد، علی سے ملتا، علی اسے جواب تک نہ دیتا، اس کی طرف رخ کر کے بات کرنا بھی اسے گوارا نہ رہا۔ اب ملاقات تو در کنار، اسے اب احمد کا چہرہ دیکھنا بھی پسند نہ تھا۔

بہر کیف، جو ہوا سو ہوا۔ کچھ عرصہ گزرا۔ سب کچھ بھول بھلیاں ہو گیا۔ ہر ایک اپنی زندگی میں مگن ہو گیا۔ فانی دنیا کے فانی رشتوں میں سے ایک اور رشتہ تھا جو قائم ہوا اور ٹوٹ گیا۔ جو فوائد اُن دونوں دوستوں نے ایک دوسرے سے سمیٹنے تھے سمیٹ لیے اور جو نقصان پہنچانا تھا پہنچا دیا۔

لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ اس واقعے سے ہمیں کیا سبق ملا؟ یہ تو صرف دوستی تھی، جس کے بارے میں مشہور یہی ہے کہ یہ ایک عارضی سا تعلق ہوتا ہے۔ بعض مرتبہ اس سے کئی گنا بڑے اور زیادہ اہم رشتے بھی معمولی سی غلط فہمی کی آڑ میں آ کر تار تار ہو جاتے ہیں۔ خاندان، گھر، رشتے داریاں، سب ملیا میٹ ہو جاتی ہیں۔

بتائیں، بھلا کون سا ایسا اچھا آدمی ہے جس سے کبھی کوئی غلطی نہ ہوئی ہو اور نہ ہو سکتی ہو؟ اور کون سا ایسا بُرا آدمی ہے جس نے کبھی کوئی اچھائی نہ کی ہو یا کر نہ سکتا ہو؟

کیا ایک غلطی کی بنا پر کسی اچھے کو بُرے کی فہرست میں ڈال دینا، اس پر باتوں کے تیر برسانا اور اُس کے دل کو پارہ پارہ کر دینا غلط نہیں ہے؟

بل کہ ہمیں اچھے بُرے انسان کی اس تفریق کو بھی نکال کر ایک طرف رکھ دینا چاہیے اور کبھی یہ

تصور بھی کر لینا چاہیے کہ سارے ہی انسان اچھے ہیں۔

ہمیں ہر ایک کو اچھا سمجھنا چاہیے، اس کا دل رکھنا چاہیے، اس کی قدر کرنی چاہیے، پیار و محبت سے اس کی کمزوریوں کو دُور کرنے کی کوشش کرنی چاہیے، اس سے اپنے اخلاق کا لوہا منوانا چاہیے، حکمت و بصیرت سے کام لینا چاہیے۔ اپنے بھائی کے لیے راتوں کو اُٹھ اٹھ کر دعائیں مانگنی چاہییں، پھر جب مقدر میں لکھا ہوگا اللہ پاک اس کی تمام خامیوں کو خوبیوں سے بدل دیں گے۔

جب ہمیں اللہ پاک کی طرف سے یہ زندگی کی دولت عطا ہوئی ہے اور جسم و روح کی امانت ہمارے سپرد ہوئی ہے، جس کے ہم مالک نہیں، بس رکھوالے ہیں، ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم اس زندگی کو کام یاب گزار کر اِس جہاں سے رخصت ہوں اور جو جو ہماری ذمے داریاں ہیں ہم انھیں بھرپور انداز سے ادا کر کے یہاں سے جائیں۔

ہماری ان ہی ذمے داریوں کو مشہور صوفی بزرگ محدث اعظم حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے پانچ شعبوں میں ذکر کیا ہے:

۱۔عقائد، ۲۔عبادات، ۳۔معاملات، ۴۔معاشرت، ۵۔اخلاقیات۔

اگر ہم صرف غور کریں تو ہمیں اندازہ ہوگا کہ ان سب کے ضمن میں کتنی باریک باتیں آجاتی ہیں۔

عبادت بھی ہے، اعلیٰ اخلاق بھی ہیں، والدین گھر والوں پڑوسیوں کے حقوق بھی ہیں اور ایسا نہیں ہے کہ ہر کام کو ایک مرتبہ کر لینا کافی ہے، بل کہ ساری زندگی ان تمام کی تمام باتوں کو پورا کرتے رہنا بھی ضروری ہے۔

اب ذرا ہم خود اپنے گریبان میں ہی جھانک کر دیکھ لیں۔ کیا ہم ان پانچ کے پانچ شعبوں میں سو فی صد کارکردگی دکھا رہے ہیں؟ ہر مہینے ہمیں اس بات کا جائزہ ضرور لینا چاہیے۔ جب ہم خود اِن پانچ امتحانوں میں سے کسی میں رعایتی نمبر لے رہے ہیں اور کسی میں ساٹھ ستر پر جا کر رُک

جاتے ہیں تو ہم دوسروں سے یہ امید کیوں رکھتے ہیں کہ وہ ہر شعبے میں سو فی صد ہوں؟ ہوسکتا ہے کہ وہ کسی اور شعبے میں ہم سے بہت آگے ہوں۔ اگر عبادات میں کمزور ہے تو اَخلاق میں اچھا ہو، یا اگر اخلاق اعلیٰ نہیں ہیں تو عبادات میں ہم سے بہت آگے ہو۔

ہمیں گنتی کے سیاہ دھبوں کے بجائے پورے صفحے کی سفیدی پر غور کرنا ہوگا۔ پیار، محبت، حوصلہ افزائی جیسے عناصر بروئے کار لانے ہوں گے، لوگوں کا دل رکھنا ہوگا، ان کی تعریف کرنی ہوگی۔

یہ بات مشہور ہے کہ سچا آدمی ہمیشہ کڑوا ہوتا ہے۔ میں اس بات کو نہیں مانتا، اور میں ہی کیا! اسلام بھی ایسی سچائی کو نہیں مانتا جس سے لوگوں کو تکلیف دی جائے۔ سچ بول کر کسی کا دِل توڑنا سچائی نہیں ہے۔ کون سی بات، کس وقت، کس سے کہنی ہے اور کس طرح کہنی ہے، یہ سب کچھ سوچ کر بولنا چاہیے۔ مخاطب کی استعداد کا بھی جائزہ لینا چاہیے۔ بنا مانگے مشورے دینا، زبردستی تنقید کرنا ہمارے وقار کو گھٹاتا ہے۔ ہر کسی کی تادیب ہرگز ہمارے ذمے نہیں ہے۔ ہمیں اپنے مقام کو بھی سمجھ کر بات کرنی ہوگی اور سامنے والے کی ہم سے امیدوں اور توقعات کا بھی لحاظ رکھنا ہوگا۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے کبھی کسی کھانے میں عیب نہیں نکالا۔ انھوں نے کبھی اپنے گھر والوں کی اس طرح اصلاح کی نہ سوچی جیسے ہمارے معاشرے میں خاوند، بیوی کی اصلاح کا سوچتے ہیں۔ پیار محبت کا درس دیا۔ گھر والوں کا ہاتھ بٹایا۔ خوش مزاجی کے ساتھ رہے۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی سب سے منفرد اہلیہ تھیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ان کے ناز و اَنداز کو صرف برداشت نہیں کیا، بل کہ پسند فرمایا۔ ہر بات میں مسکراہٹ، ہر موقع پر مثبت جواب دینا۔ یہ تھے ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے کریمانہ اخلاق۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی دس سال خدمت کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے کبھی مجھے کسی بات کے متعلق یوں نہیں کہا کہ ایسا کیوں کیا اور ایسا کیوں نہیں کیا۔ ایک مرتبہ مجھے کسی کام کے لیے بھیجا۔ میں جا کر بچوں کے ساتھ کھیلنے لگ گیا۔ اس پر بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے مجھے

کچھ نہیں فرمایا۔

ہمیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ ہم حضرت اسماعیل علیہ السلام کی روحانی اولاد ہیں۔ ہمارے دادا پیر کے اخلاق کا اثر ہم میں بھی تو ہونا چاہیے۔ اللہ پاک اپنے کلام پاک میں ارشاد فرماتے ہیں:

فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِيْمٍ ﴿١٠١﴾

ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو ایک ایسے بیٹے کی خوش خبری سنائی جو صبر و تحمل سے لبریز اور حلم و برداشت کے پہاڑ تھے۔

جب ہم اپنے حقوق کا مطالبہ چھوڑ کر اوروں کے حقوق ادا کرنے لگ جائیں گے تب ہی ہم ترقی کی راہ پر گام زَن ہو سکیں گے۔ محبت کا درس دینے والوں میں ہم شمار ہوں گے۔ ہمیشہ خوش حال رہیں گے اور ہماری حیثیت ایک مقتدا، ایک قائد کی ہوگی۔ جتنا زیادہ ہم بڑا دل رکھیں گے اتنے ہی ہم بڑے ہوں گے اور اتنا ہی اللہ تعالیٰ بھی اور لوگ بھی ہمیں چاہیں گے۔

آج کی کہانی

۱۰، اپریل ۲۰۲۰ء کے جنگ اخبار میں جناب اسلم جمشید پوری صاحب کا مقالہ ''سفر نامہ نگاری کے بدلتے رنگ'' پڑھنے کا حسین اتفاق ہوا۔ انتہائی وقیع، علمی اور دل چسپ موضوع پر موصوف رقم طراز ہوئے ہیں اور بہت ہی تحقیقی انداز سے انھوں نے علم ادب کی اس اہم ترین صنف کو مختلف ادوار میں تقسیم کیا ہے۔

ان کے مطابق اردو زبان میں سب سے پہلا جو سفر نامہ لکھا یا گیا وہ یوسف خان کمبل صاحب کا تھا جو ۱۸۴۷ء میں عجائبات فرنگ کے نام سے شائع ہو کر منظر عام پر آیا۔

اس کے مطابق اب تک جو زمانہ گزرا ہے وہ تقریباً پونے دو سو سال کا ہے۔ تقریباً تمام ہی سفر نامے اپنے سماج اور اُس کی خوبیوں کے عکاس بتائے گئے ہیں، ورنہ اپنی قوم وملت پر کچھ نہ کچھ گفتگو تو ہر کوئی کرتا رہا ہے۔ وطن و تہذیب کا دفاع بھی ایک اہم عنصر رہا ہے۔

البتہ ابتدائی دور میں سفر ناموں میں علمی رنگ غالب رہتا تھا۔ خصوصاً جغرافیائی اور تاریخی حیثیت کا بیان تو لازمی طور پر کیا جاتا تھا۔ ساتھ ہی اس قوم کے احوال، وہاں کی تہذیب وثقافت، سماجی و معاشی مسائل پر گفتگو کا انبار ملتا تھا۔ اسی کے ضمن میں پیش آنے والے سفر، لوگوں سے ملاقاتیں وغیرہ سب باتیں آجاتی تھیں۔ شاید اِس کی ایک اہم وجہ یہ ہو کہ عربی زبان کے مشہور سفر ناموں کا انداز یہی رہا ہے۔ خصوصاً ابن بطوطہ کا سفر نامہ اسی انداز کا ہے۔ یہ انیسویں صدی سے لے کر بیسویں صدی کے نصف تک کا دور ہے۔

اس دور کے چند اہم سفر نامے یہ ہیں:

سفر نامہ حجاز (مولانا عبدالماجد دریا آبادی)

لندن سے آداب عرض (آغا محمد اشرف)

سفر نامہ بغداد (منشی محبوب عالم)

اس کے بعد کے دور میں سفر نامہ نگار کی ذاتی حیثیت بڑھتی چلی جاتی ہے۔ گھر سے نکلنے سے لے کر گھر لوٹنے تک کے تذکرے بھی شامل ہونے لگتے ہیں۔ ذاتی تاثرات اور آرا میں اضافہ نظر آتا ہے اور منظر نگاری بھی پہلے سے کچھ الگ نوعیت اختیار کر لیتی ہے۔ تخلیقی انداز اور معنویت میں بڑھوتری محسوس ہوتی ہے۔ قلم نگار کی ذاتی کیفیت بھی شامل ہونے لگتی ہے۔

اور دیکھا جائے تو یہ نیا اسلوب اور طرزِ تحریر آزادیِ پاکستان کے بعد پاکستان کی طرف ہجرت سے متعلق سفر نامے میں اختیار کیا جاتا ہے اور اِس کے ۲۵، ۳۰ سال بعد اکثر مشہور سفر نامے اسی انداز کی پیروی کرنے لگتے ہیں۔

پاکستان ہجرت کے موقع پر لکھے گئے سفر نامے عجیب و غریب داستانیں رقم کیے ہوئے ہیں۔ بے پناہ جستجو کے بعد ملنے والے اس ملک اور اِس کے حصول میں دی جانے والی لوگوں کی حیرت انگیز قربانیوں کا ایک سمندر ہے اور صرف عنوان سے یا کتاب کی جلد پر طبع شدہ کتاب کے نام سے ہی اس کی پیچھے چھپی درد بھری کہانیوں اور ذبح کی ہوئی آرزوؤں کی جھلکیاں نظر آنے لگتی ہیں۔

ان میں سے دو کے نام عرض کر دیتے ہیں:

نئے شہر، پرانی بستی (مولانا عبدالماجد دریا آبادی)

ہند یاترا (ممتاز مفتی)

اس کی پیروی میں جو نیا انداز سفر ناموں نے دھارا، وہ بھی منظر نگاری کی اعلیٰ ترین بلندیوں پر فائز تھا۔ بیسویں صدی کے اخیر میں اس ادبی لہلہاتے سمندر میں ابن انشا، قدرت اللہ شہاب اور ان جیسے بحر علوم قدم رکھتے ہیں، جن کی تحریروں میں لطافت اور شوخ بازی بھی بڑے پیمانے پر

پائی جاتی ہے۔

پھر یہی کارواں اکیسویں صدی میں بھی نئے جوش وجذبے کے ساتھ داخل ہوتا ہے۔اس میں تجسس، تحیر اور ہر طرح کا لطف پایا جاتا ہے اور ہر طرح سے قاری کی دل چسپی اور ذوق کو تحریر میں باقی رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔حتیٰ کہ بعض وہ سفرنامے جن کے خالق افسانہ نگار ہیں، اپنے اندر افسانوی رنگ وروپ بھی رکھتے ہیں۔

کالم نگار اسلم جمشید پوری صاحب نے ان پونے دوسو سال کا کافی اچھا تحقیقی اور علمی تجزیہ پیش کیا ہے اور کافی گہری نگاہ ڈالنے کے بعد وہ اس نظریے تک پہنچے ہیں۔گو کہ اب بھی ہر کوئی اپنا انداز اختیار کرنے میں آزاد ہے، البتہ اس صنف میں مشہور اور رائج طریقہ کار سے واقفیت اور ساتھ ہی اسے پیش آنے والے ادوار کا علم ہر اَدیب کے لیے ضروری ہے۔

انٹرویو بہاروں کی برسات کا

آج کے انٹرویو کی مہمان میری والدہ محترمہ ہیں۔ساٹھ کی دہائی میں بھی انتہائی چاق وچوبند، بلند ہمت اور اعلیٰ صفات کی حامل میری ماں ،جنھوں نے بہت ہی محبت اور خلوص سے مجھے پالا پوسا، بڑا کیا اور آج جہاں ہوں، جو ہوں انھی کی برکت سے ہوں اور اَب بھی ان کے سائے تلے انتہائی لاڈ اور پیار سے عیش کی زندگی بسر کرر ہا ہوں۔اللہ پاک ہر بُری نظر سے محفوظ فرمائے۔آمین۔

چلیں اب انٹرویو کی طرف آتے ہیں۔

محمد سعد: جی امی جان! السلام علیکم! کیسی ہیں آپ؟ سب سے پہلے ہم آج کا تعارف جاننا چاہیں گے۔

امی جان: ہمم......میرا کیا تعارف۔ایک اللہ کی ادنیٰ مخلوق ہوں جس پر اُس کی ہزار ہا نعمتیں برستی رہتی ہیں۔اصل تعریف تو اُس خدائے وحدہٗ لاشریک کی ہے جس نے اس سارے جہاں کو وجود بخشا ہے۔

آپ کا شکریہ آپ نے مجھے اس انٹرویو کے قابل سمجھا۔اصل طاقت تو اللہ تعالیٰ کی ہے۔سب کچھ اسی کی دین ہے۔ہم تو اُس کے بندے ہیں۔

محمد سعد: اچھا امی جان! آپ کے بچپن کا کچھ تذکرہ ہو جائے؟

امی جان: بیٹا بہت اچھا دور گزرا ہے۔انتہائی سادہ، بے تکلفانہ زندگی ہوتی تھی۔زیادہ تر تربیت پر توجہ تمھارے نانا محترم دیتے تھے اور تمھاری نانی گھر کی خدمت، پالنے پوسنے اور ہم

تمام بھائی بہنوں کو بڑا کرنے کی فکر میں لگی رہتی تھیں۔

بیٹا! اس دور میں بے حیائی نہ تھی، اس طرح میڈیا نہ تھا۔ موبائل نہ تھے۔ اس دور کی ایک بڑی خوبی یہ تھی۔

البتہ ایک خامی یہ ضرور تھی کہ اس دور میں دین کا شعور اِتنا عام نہ تھا، لوگوں کو دینی مسائل کی خبر نہ ہوتی تھی۔ اب الحمدللہ! اس حوالے سے کافی ترقی ہو چکی ہے۔

محمد سعد: ماشاءاللہ! امی جان! نسل نو کی ماؤں کو کچھ ارشاد فرمائیں۔ اولاد کی تعلیم و تربیت کے متعلق کچھ راہ نمائی فراہم کریں۔

امی جان: پہلی گود تو بیٹا ماں کی ہی ہوتی ہے۔ بچے وہی کرتے ہیں جو وہ اپنے ماں باپ سے سیکھتے ہیں اور خصوصاً ماں کا اولاد کی تربیت میں بہت گہرا اثر پڑتا ہے۔

بس اپنے بچوں کی صحیح راہ نمائی کرتی رہیں اور صرف دنیا ہی نہیں ان کی آخرت کے لیے بھی فکر مند ہوں۔ ان کی دین داری پر خاص توجہ دیتی رہیں۔ بچے جب تک اللہ کے نہیں ہوں گے، ماں باپ کے بھی نہیں ہو سکتے۔

خاص طور پر موبائل اس دور کا ہمارا بہت بڑا دشمن ہے۔ ہر کوئی اس میں مبتلا ہے۔ اس کے استعمال پر کسی طرح قابو پانے اور اُسے محدود کرنے کی کوشش کی جائے۔

محمد سعد: امی جان! میں آپ کی بات سے سو فی صد اتفاق کرتا ہوں۔ خاص طور پر موبائل کے استعمال کو تو بہت زیادہ محدود کرنے کی ضرورت ہے اور اِنتہائی محتاط رہ کر اِس کا استعمال ہونا چاہیے۔

اچھا امی جان! اگلے سوال کی طرف آتے ہیں۔ موجودہ حالات کے تناظر میں کچھ کہنا چاہیں گی، جب کہ کرونا وائرس نے معمول کی زندگی کو بالکل بدل کر رکھ دیا ہے؟

امی جان: بس بیٹا! اللہ پاک اپنے رحم و کرم کا معاملہ فرما کر اِس بیماری کو ہم سے ختم کر دے۔ لوگ پریشان ہیں۔ طرح طرح کی بیماریوں میں مبتلا ہیں۔ خاص طور سے روز کمانے والے غریب

لوگوں پر تو بہت بڑی آفت ٹوٹ پڑی ہے۔ کھانے پینے میں دشواری ہوگئی ہے۔ رہن سہن مشکل ہو گیا ہے۔

ساتھ ساتھ یہ بھی بہت بڑی پریشانی کی بات ہے کہ اللہ پاک نے اپنے گھر کے دروازے ہم پر بند کر دیے ہیں۔ حرمین جیسی مقدس جگہوں تک کو تالے لگا دیے ہیں۔ اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ اللہ پاک ہم سے بہت زیادہ ناراض ہیں۔

اللہ پاک ہمیں معاف فرما دے۔ ہم سب کو اپنے حفظ و امان میں رکھے اور اِس بیماری کو جلد اَز جلد ہم سے دور کر دے۔

محمد سعد: امی جان! کچھ ملک کی ترقی سے متعلق بھی راہ نمائی کریں۔

امی جان: بیٹا! ملک کی ترقی تو تب ہی ہوگی جب اس میں رہنے والے لوگ دین پر چلیں گے۔ عمدہ اخلاق، حیا و پاک دامنی، شب بیداری کا جیتا جاگتا کردار ہوں گے اور لوگ وہی کرتے ہیں جو وہ میڈیا سے سیکھتے ہیں۔ ہماری حکومت اگر نیکو کاروں کی ہو جائے اور وہ میڈیا کی اصلاح کر لے تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے۔

محمد سعد: کیا خوب بات کہی ہے امی جان! بس اللہ آپ کی زبان مبارک کرے۔

اچھا چلیں امی جان! یہ تو بتائیں کہ عورتوں کے بازاروں میں جانے سے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟

امی جان: بیٹا! میں عورتوں کے بلاوجہ بازاروں میں نکلنے کے سخت خلاف ہوں۔ ہاں، اگر بہت زیادہ ضرورت ہو تو جائے اور گھر سے پردہ کر کے، نقاب اوڑھ کر بازار کے لیے نکلے۔

محمد سعد: آپ کی یہ بات سن کر مجھے بہت خوشی ہوئی۔ خاص کر امی جان! جب گھر میں مرد حضرات، عورت کی خدمت کے لیے موجود ہوں تو عورت کے لیے فکر کی ہی کیا بات ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے تو عورت کو گھر کی خادمہ یا نوکرانی نہیں کہا، بل کہ گھر کی ملکہ کا مرتبہ دیا ہے۔ بھلا اس سے زیادہ بڑا

اور باعزت مقام عورت کے لیے کون سا ہوسکتا ہے؟ اسلام ہی نے تو دنیا کو بتایا ہے کہ تہذیب و ثقافت کسے کہتے ہیں۔ امریکا یورپ نے جو خیر سیکھی ہے وہ اسلام ہی سے تو سیکھی ہے۔

امی جان! اب میں آپ سے اس انٹرویو کے آخری سوال کی طرف آرہا ہوں۔ امی جان! کرونا وائرس کی وجہ سے ہونے والے نقصانات کا تو سب کو علم ہے۔ اس سے ہمیں جو فوائد حاصل ہوئے ہیں اس کے متعلق بھی تو کچھ بتائیں؟

امی جان: اس کے فوائد پر میں کیا بات کروں بیٹا!؟ سو سال پہلے کی زندگی ایک بار پھر لوٹ آئی ہے۔ دکانیں جلدی بند ہو رہی ہیں۔ لوگ گھر میں زیادہ وقت دے رہے ہیں۔ باہر کے فتنوں سے محفوظ ہو گئے ہیں۔ خوامخواہ گھومنا، بازار کا کھانا، فضول خرچی، سب کچھ یک دم ختم ہو گیا ہے۔ لوگ اللہ تعالی اور آخرت کی طرف متوجہ ہو رہے ہیں۔

محمد سعد: اچھا امی جان! ہمارا آج کا یہ انٹرویو بس اختتام کو پہنچ چکا ہے۔ کیا آپ لوگوں کو کوئی پیغام دینا چاہیں گی؟

امی جان: بس بیٹا! یہی پیغام ہے کہ بڑوں کا احترام کریں۔ اللہ کے احکامات کو پورا کریں۔ دین پر چلیں۔ نماز اور تلاوتِ قرآن پاک کی پابندی کریں۔

دنیا میں رہیں، لیکن آخرت سے غافل نہ ہوں۔ اپنے پالنے والے رب کو نہ بھولیں۔ دعاؤں کی عادت ڈالیں۔ سچائی کو اپنائیں اور ہر وقت یہ سوچتے رہیں کہ اللہ پاک انھیں دیکھ رہا ہے۔

محمد سعد: جزاک اللہ، امی جان! میں آپ کا بہت بہت شکر گزار ہوں۔ آپ نے اپنا اتنا قیمتی وقت دیا اور اتنی ساری پیاری پیاری باتیں بتائیں، پھر اِن شاء اللہ! آپ کا مزید وقت لیتا رہوں گا۔ اللہ حافظ۔ السلام علیکم۔

الحمد للہ! یہ میری زندگی کا پہلا نجی انٹرویو تھا، جو میں نے لیا۔ اس سے پہلے جاب انٹرویو لینے کا تو موقع ملا ہے، لیکن اس طرح کا انٹرویو لینے کا اتفاق پہلی بار ہوا۔

خامیوں سے خوبیوں تک

رب کائنات کی بنائی ہوئی اس دھرتی میں روزِ اول سے بھونچال رہا ہے۔ انسان کو طرح طرح کے مسائل کا سامنا کرتے رہنا پڑتا ہے۔ اللہ پاک جا بجا مختلف طرح کی آزمائش کا ذکر فرماتے ہیں۔ یہ بتاتے ہیں کہ تمھیں دنیا میں آزاد نہیں چھوڑا جائے گا، آزمایا جائے گا، مشکلات کا شکار کیا جائے گا اور بڑی تاکید اور جزم سے یہ بات ارشاد فرماتے ہیں۔ ساتھ ساتھ اس پر سابقہ اقوام کی مثالیں بھی دیتے ہیں، جن پر آنے والے مسائل اور مصیبتیں ہمارے مسائل سے کئی گنا بڑھ کر تھی۔ اسی طرح جب ان پر عذاب آتا تو وہ بھی بہت بھیانک ہوتا تھا۔

بعض آزمائشیں تو ہر اِنسان کی اپنی ہوتی ہیں۔ چند کا تعلق پوری قوم وملت سے ہوتا ہے۔ ایسے موقع پر عمدہ قیادت اور قوم وملت کے اعلیٰ ترین دماغ بروئے کار لائے جاتے ہیں اور صحیح معنوں میں ان کی صلاحیتوں کا امتحان ہوتا ہے۔ اس وقت ہر روحانی و مادی حربہ اختیار کرنا ہوتا ہے۔ صرف خود کو ہی نہیں، قوم کو راہِ راست پر لانا ہوتا ہے۔ مقتدا کا اصل کام ہی یہی ہے۔

موجودہ دور میں بھی صورت حال کچھ ایسی ہی ہے۔ کرونا نے ساری دنیا کو بند کر دیا ہے۔ آمد و رفت، تجارت، تعلیم، سب چیزیں معطل ہو چکی ہیں۔ زندگی گویا موقوف سی ہوگئی ہے۔

موجودہ دور میں تمام اقوام چند مشترک مسائل کا شکار ہیں اور اُن کے حل اور سد باب کے لیے کوشاں ہے۔ ہر قوم ایک تو کرونا کو کنٹرول کرنے کی فکر میں ہے اور لوگوں کو زیادہ سے زیادہ آئسولیٹ کرنے اور اِحتیاطی تدابیر پر عمل کرانے کی فکر میں ہے۔ دوسرے یہ کہ جو لوگ بے روزگار

ہو گئے ہیں یا روز کے کمانے والے تھے اور ابھی بدحالی کا شکار ہیں، ان کے ساتھ تعاون کی ترتیب بنا رہے ہیں۔

ان دو بنیادی مسائل کے فوری اور عمدہ ترین حل کی ضرورت ہے۔ اس کے علاوہ جو دیگر مسائل ہیں اور جو معاشی بحران متوقع ہے، اس کے متعلق فی الحال توکل سے بڑھ کر ہمارے پاس کوئی صورت نہیں ہے۔

وزیراعظم پاکستان، وزیراعلیٰ سندھ، اسی طرح دیگر حکومتی ممبران انتہائی مبارک باد کے مستحق ہیں جو کہ بخوبی قوم کے مسائل سے واقف ہیں۔ اربوں کے فنڈز جاری کر رہے ہیں اور اِحتیاطی تدابیر کے طور پر بھی بہت سے اقدامات کر چکے ہیں اور کر رہے ہیں۔

ویسے تو اِن کی زیرکی اور ذہانت دیکھ کر یہی توقع کرنی چاہیے کہ انھیں ان امور میں تا حال پائی جانے والی تمام کوتاہیوں کا بھی بخوبی علم ہوگا۔

البتہ ایک خادم کی حیثیت سے چند پیش آنے والے مسائل سے آگاہ کرنا اپنا فریضہ سمجھتا ہوں، تا کہ آئندہ کے لائحہ عمل میں ان کمزوریوں کا ازالہ کیا جا سکے۔

ایک تو یہ کہ احساس پروگرام کے تحت اب تک جو راشن دیا گیا ہے، منظم انداز سے نہیں دیا جا سکا۔ کرونا کی احتیاطی تدابیر بھی فوت ہو گئیں، عورتوں کے لڑائی جھگڑے، یہاں تک کہ حادثات تک ہو گئے۔ اسی طرح قادیانیوں کی اس میں شمولیت مذہبی طبقے کے لیے اشتعال کا باعث ہے، لہٰذا اِس کا اس طرح انتظام ہونا چاہیے کہ نہ کسی کو تکلیف پہنچے اور نہ ہی ناانصافی ہو۔

دوسرے یہ کہ احتیاطی تدابیر اختیار کرتے وقت مساجد اور ائمہ مساجد کو تشدد کا نشانہ نہ بنایا جائے۔ علما کے مشورے اور اُن کی متفقہ رائے کے مطابق کام کیا جائے۔ تشدد اِختیار کرنے سے قوم کے جذبات مجروح ہوتے ہیں اور قوم کے دل میں حکومت کی نفرت بیٹھ جاتی ہے۔

باقی امداد کی شکل میں یا خرید کر حاصل کر کے جتنا بس میں ہے، ہماری حکومت وینٹلیٹر، ماسک

وغیرہ سب کچھ حاصل کر رہی ہے۔ اللہ پاک ان کی مدد فرمائے۔

نرخ بڑھانے کے جرم میں بعض مرتبہ جنرل اسٹوروں کو نشانہ بنایا جاتا ہے۔ یہ بات درست ہے کہ یہ لوگ ان حالات میں مال مہنگا بیچ کر بہت بڑے جرم کے مرتکب ہیں، مگر یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ اصل مجرم کوئی اور ہے۔ جو لوگ انھیں مال دیتے ہیں، ذخیرہ اندوزی اور مال مہنگا سپلائی کرتے ہیں، اصل جرم ان کا ہے۔ اور جیسا کہ اب ثابت ہو چکا ہے، اس جرم میں حکومت کے بھی کئی اہلکار شامل ہیں، ان کا اپنا ہی کاروبار اِس نوعیت کا ہے، پھر وہ سرکاری عہدے سے غلط فائدہ اٹھاتے رہے ہیں۔ خاص کر چینی کے اسکینڈل میں بڑوں بڑوں کے نام آئے ہیں۔ ان افراد کی بھی بلاتفریق خبر گیری کی جانی چاہیے اور اُن سے محتاط رہنا چاہیے۔

امید ہے کہ ارباب حکومت ان خامیوں کو خوبیوں سے بدل دیں گے اور ملک وملت کی بھلائی کے جذبے میں اللہ پاک ان کی مدد فرمائیں گے۔

تین بہن بھائی اور لاک ڈاؤن کے دن

یہ تین بہن بھائیوں کا واقعہ ہے، جو کہ بہت ہی اچھے گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ماں باپ کے چہیتے ہیں، ان کے فرماں بردار بھی ہیں اور اللہ تعالیٰ کو بھی راضی کرتے ہیں۔ ان کے نام عشاء، ایان اور حمزہ ہیں۔

لیکن......

کرونا وائرس کی وجہ سے ان بچوں میں موجود شرارتوں کا پارا اوپر چڑھ چکا تھا۔ ہر چیز اُلٹ پلٹ ہو چکی تھی۔ سارا نظام الاوقات درہم برہم ہو چکا تھا۔

بس کھانا، پینا، سونا اور آپس میں لڑنا ہی کام رہ گیا تھا۔

دو بھائیوں کی بڑی بہن ان میں قدرے سمجھ دار اور سنجیدہ طبیعت کی حامل ہے۔ اس کا نام عشاء ہے۔

ان کی امی جان بھی بچوں کی تربیت کے لیے ہر وقت فکرمند رہتی ہیں۔ ایک دن انھیں یہ ترکیب سوجھی کہ میں سب سے پہلے عشاء کو سمجھاتی ہوں اور اُسے ایک ذمے داری دے کر دیکھتی ہوں کہ وہ اسے کس طرح نبھاتی ہے۔

امی جان نے عشاء کو آواز دی۔

''جی امی جان! آپ نے بلایا؟'' عشاء دوڑتی ہوئی آئی۔

امی جان نے کہا: ''بیٹی! ایک بہت اہم بات کہنے جا رہی ہوں۔ اسے اپنے پلو سے باندھے

رکھنا۔'' یادرکھو گی نا؟''

''جی امی جان!'' عشاء کہہ اٹھی۔

''بیٹی! زندگی ایک سفر ہے۔ زندگی کے اس سفر سے فائدہ اٹھانے والے کام یاب ہوتے ہیں اور جو زندگی کے اس سفر کو ضائع کر دیتے ہیں وہ ہاتھ ملتے رہ جاتے ہیں، ان کے ہاتھ کچھ نہیں آتا۔ ہمیں جو چھٹیاں ملی ہیں ہمیں انھیں قیمتی بنانا ہوگا۔

عبادت، تعلیم، ذکر، تفریح، ہر ایک کو مناسب وقت دینا ہوگا، ورنہ ہماری زندگی فضولیات کی نظر ہو کر رہ جائے گی اور اِس قیمتی سرمائے سے ہم کوئی فائدہ نہیں اٹھا پائیں گے۔ میں چاہتی ہوں کہ تمھارے ساتھ تمھارے دونوں چھوٹے بھائی بھی کارآمد بنیں۔ انھیں وقت دیا کرو، ان کی تربیت میں میرا ساتھ دو۔ بتاؤ، ساتھ دو گی میرا؟''

''بالکل امی جان! میں آپ کے ہر کام میں آپ کے شانہ بشانہ کھڑی ہوں۔'' امی کی بات پر عشاء نے کہا۔

امی کے پاس سے عشاء باہر نکلی ہی تھی کہ اسے زور سے چیخنے چلانے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ ذرا اُس طرف متوجہ ہوتی ہے تو کیا دیکھتی ہے کہ اس کے دونوں بھائی ایان اور حمزہ، آپس میں لڑ رہے ہیں۔

''میں تمھیں نہیں چھوڑوں گا۔ میں تمھیں خوب مزہ چکھا کر رہوں گا۔'' دونوں جانب سے صدائیں بلند ہوتی دکھائی دے رہی ہیں۔

اس سے پہلے کہ معاملہ مزید بگڑ جائے عشاء آناً فاناً بھائیوں کے پاس پہنچ جاتی ہے:''کیا بات ہے بھئی!؟ کیوں لڑ رہے ہو؟''

''اس نے میرا سب سے پسندیدہ کھلونا توڑ دیا ہے۔'' ایان، حمزہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بول اٹھا۔

حمزہ بھی خاموش نہ رہ پایا اور آستین اونچی کرتے ہوئے کہنے لگا: ''اس نے بھی میری بہت سی چیزیں چھپا لی ہیں اور کھیلتے وقت ہمیشہ مجھے دھوکا دیتا ہے۔''

(ایان دونوں بھائیوں میں بڑا ہے اور اپنا بڑا پن ظاہر بھی کر کے رہتا ہے، جب کہ حمزہ جہاں سیدھا سادا ہے، لیکن اپنی بات کا پکا بھی بہت ہے۔)

کچھ دیر تک تو عشاء ان کی تُو تُو میں میں سنتی رہی۔ آخر کار بول اٹھی: ''بس کرو اپنا ڈرامہ، اب میری باری ہے۔''

''کیا مطلب باجی!؟ کیا آپ بھی ہمارے ساتھ لڑائی میں شریک ہوں گی؟'' ایان کہنے لگا۔

"اوہو! اللہ کے بندو! چھوڑو اپنی اس روزمرہ کی کہانی کو۔ آؤ، آج کچھ نیا ہو جائے۔'' حکمت سے عشاء کہنے لگی۔ ''اور اگر تم دونوں نے میری بات غور سے سنی، میں تمھیں اپنے ہاتھ سے فرنچ فرائز بنا کر کھلاؤں گی۔''

دونوں بھائیوں کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

''کہیے بہنا! آپ کی نہ سنیں گے تو کس کی سنیں گے!'' حمزہ بول پڑا۔

''میں تمھیں ایک کہانی سناؤں گی اور پھر ایک کام دوں گی۔ تیار ہو؟''

''جی بالکل بہنا!'' دونوں بھائی یک دم بول اٹھے۔

''کہانی شروع ہونے سے پہلے مجھے بتاؤ کہ ہمیں کس نے پیدا کیا ہے؟''

بھائیوں نے جواب دیا: ''اللہ میاں نے۔''

''اچھا یہ بتاؤ کہ ہمیں کس کی عبادت کرنی چاہیے؟'' عشاء نے پوچھا۔

دونوں بھائیوں نے کہا: ''اللہ تعالیٰ ہی کی عبادت کرنی چاہیے۔ ہمیں اسکول میں ہماری استانی نے یہ بات بتائی تھی۔''

''شاباش! بالکل درست کہا۔ اچھا اب غور سے سننا۔ یہ کہانی ہے سات شہزادوں کی۔

بہت عرصہ پہلے کی بات ہے کہ ملک شام میں ایک ظالم بادشاہ ہوا کرتا تھا، جس کا نام تھا ''دقیانوس''۔ وہ بہت ہی ظالم تھا اور لوگوں کو اللہ کے ساتھ اور مخلوق کی بھی عبادت کا حکم دیتا تھا اور اُنھیں خدا ماننے پر مجبور کرتا تھا۔ اللہ کے ساتھ کسی اور کو خدا ماننا یا اس کی عبادت کرنا شرک کہلاتا ہے اور شرک حرام ہے۔ شرک کرنے والا شخص مسلمان نہیں رہتا اور اُس کے لیے ہمیشہ کی جہنم کا فیصلہ ہو جاتا ہے۔

وہ بادشاہ لوگوں کو شرک پر مجبور کرتا تھا، لیکن اللہ جسے ہدایت دینا چاہے اسے کون گم راہ کر سکتا ہے؟ شاہی خاندان ہی کے سات نو جوانوں کو اللہ پاک نے ایمان کی دولت عطا کی اور وہ اس میں پکے رہے۔ انھوں نے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانے سے مکمل طور پر اِنکار کر دیا۔ بادشاہ نے ان پر دباؤ ڈالا، انھیں سمجھایا اور اُنھیں توحید سے ہٹانے کی بھرپور کوشش کی، لیکن اللہ پاک نے انھیں ثابت قدم رکھا اور شرک سے ان کی حفاظت کی۔

بادشاہ نے انھیں چند دِن کی مہلت دی اور اُس کے بعد پتا ہے کیا فیصلہ کیا؟ بادشاہ نے فیصلہ یہ کیا کہ ان نو جوانوں کو جان سے مار دیا جائے، لیکن اللہ تعالیٰ نے یہ فیصلہ کیا کہ انھیں بچایا جائے اور قیامت تک ان اللہ والوں کے تذکرے کو باقی رکھا جائے۔''

''اور ایسا کیسے ہوا؟'' حمزہ نے پوچھا۔

''ایسا ایسے ہوا کہ جس روز بادشاہ نے انھیں قتل کرنا تھا، اس سے ایک رات پہلے وہ نو جوان محل سے فرار ہونے میں کام یاب ہو گئے اور شہر سے باہر نکل گئے۔ چلتے چلتے ان کی نظر ایک غار پر پڑی۔ وہ غار میں داخل ہو کر آرام کرنے لگے۔

پھر پتا ہے کیا ہوا؟

اللہ پاک نے انھیں ۳۰۹ سال تک سلائے رکھا۔ باہر اُن کی حفاظت کے لیے ایک کتا مقرر کر دیا۔ وہ بھی سویا ہوا تھا اور اُسے دیکھ کر ایسا لگتا تھا کہ وہ شیر ہے۔ اس طرح بادشاہ کی فوج بھی

ڈر کے مارے انھیں نہیں پکڑ سکی۔

پھر ۳۰۹ سال بعد جب وہ بادشاہ اس دنیا سے جا چکا ہوتا ہے اور اُس کی جگہ ایک انصاف پسند بادشاہ آجاتا ہے، اس دور میں اللہ پاک انھیں جگاتا ہے۔ جب یہ نوجوان جاگتے ہیں تو اُنھیں یوں محسوس ہوتا ہے کہ بس تھوڑی ہی دیر سو کر اُٹھے ہیں۔ ان میں سے ایک کھانا لانے کے لیے شہر آجاتا ہے۔ وہاں جب بازار میں وہ پرانے زمانے کا سکہ پیش کرتا ہے تو دکان دار ہکا بکا رہ جاتا ہے۔ کرتے کرتے بادشاہ اور سارے بستی والوں کو یہ بات معلوم ہو جاتی ہے کہ یہ وہی لوگ ہیں جو کئی برس پہلے غائب ہو گئے تھے اور اُن کی داستانیں آج تک ہم میں مشہور ہیں۔

بستی کے تمام لوگوں کا اللہ تعالیٰ کی قدرت پر یقین بڑھ جاتا ہے۔ انھیں یقین آجاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے آگے کسی کی مرضی نہیں چلتی، وہ سب کا بادشاہ ہے اور جو بھی اللہ کے دین پر چلتا ہے، اللہ پاک اس کی حفاظت فرماتے ہیں۔ وہ اکیلے ہی دنیا کی ساری طاقتوں کے خلاف کافی ہو جاتے ہیں۔ ساری حکومت، فوج و سلطنت، بادشاہ، سب دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں اور وہ اللہ کے نیک بندوں کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ اللہ پاک، اللہ والوں کی حفاظت فرماتے ہیں اور اپنے دشمنوں کو تہس نہس کر دیتے ہیں۔

ہم م م......تو کیا سمجھے بھائیو؟ اللہ کی مانو گے یا شیطان کی مانو گے؟

دونوں بھائی حمزہ اور ایان یکسر اُٹھے، دایاں بازو آسمان کی طرف بلند کیا اور کہنے لگے: ’’اللہ کی!‘‘

’’اور کس کی عبادت کرو گے؟‘‘ عشاء نے کہا۔

ایک بار پھر دونوں بھائیوں نے بآواز بلند کہا: ’’اللہ کی!‘‘

’’دیکھو بھائیو! ان چھٹی کے ایام کو ہمیں قیمتی بنانا ہے۔ آگے رمضان شریف کا مہینا بھی قریب ہے۔ ہمیں پانچ وقت نماز پڑھنی ہے، قرآن شریف پڑھنا ہے اور اچھی اچھی باتیں سننی اور پڑھنی ہیں۔ اورررر......‘‘

''کیا''اور''باجی!؟''حمزہ نے کہا۔

''اور یہ کہ موبائل کو ہاتھ نہیں لگانا۔گیم نہیں کھیلنے۔میوزک نہیں سننا۔اس سے اللہ پاک ناراض ہوتے ہیں اور ہمارے پیارے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان چیزوں سے منع فرمایا ہے۔''

''باجی!موبائل اور گیم والی بات تو آپ نے ایان کے مطلب کی کہہ دی۔''حمزہ مذاقاً کہنے لگا۔

''ارے نہیں پیارے!اس بات میں میرا مخاطب ہر وہ شخص ہے جو موبائل کے جال میں بُری طرح پھنس چکا ہو۔چھوٹا ہو یا بڑا،لڑکا ہو یا لڑکی۔آج کے دور میں ہر کسی کو اِس سے بچنے کی ضرورت ہے۔سب کو اِس نے خراب کر دیا ہے۔

گیم،سوشل میڈیا،یہ سب ایک جال ہی نہیں تو کیا ہے۔ساتھ بیٹھے لوگ بھی الگ الگ دنیا میں مست ہوتے ہیں۔گھر میں ہوتے ہوئے بچے،ماں باپ کو وقت نہیں دے پاتے،قرآن شریف نہیں پڑھ پاتے،سبق پر دھیان نہیں دیتے۔جب دیکھو موبائل پر لگے رہتے ہیں۔''

''عشاء باجی!آپ دیکھیے گا،میں موبائل کو ہاتھ بھی نہیں لگاؤں گا اور جو کچھ آپ نے کرنے کا کہا ہے،میں وہ ضرور کروں گا۔''جذبے کے ساتھ ایان کہنے لگا۔

''میں بھی عشاء باجی!میں بھی عشاء باجی!ہم مل کر اِن شاء اللہ!ایک دوسرے کا ساتھ دیں گے اور نیکی میں آگے بڑھنے کی کوشش کریں گے۔''حمزہ نے ہمت افزائی کرتے ہوئے کہا۔

''واہ!یہ ہوئی نا بات!چلو ابھی رات دیر ہوگئی ہے۔اپنے بستروں پر جاؤ اور سنت طریقے کے مطابق دائے کروٹ پر لیٹ کر قبلہ رخ سو جاؤ۔

اور ہاں،پہلے وضو کر کے دو رکعت نفل پڑھنا اور سونے کی دعا پڑھنا نہ بھولنا اور میں نے جو باتیں آج بتائی ہیں ان پر ایک بار غور ضرور کرنا ہے۔

اچھا سونے کی دعا کون سنائے گا؟''

''میں،عشاء باجی!''حمزہ نے کہا۔'' اَللّٰھُمَّ بِاسْمِكَ أَمُوْتُ وَأَحْیَا۔''

''ماشاءاللہ! شاباش! چلو، اب جلدی سو جاؤ، تہجد میں بھی اٹھنا ہے۔'' عشاء نے کہا۔

اسی بات پر اِن نیک روحوں کا دن مکمل ہوا۔ انھوں نے کرونا میں گزرتے ان ایام کو قیمتی بنانے کا عزم کرلیا۔

آیئے، ہم سب بھی ان کے ساتھ مل کر یہ عزم کرتے ہیں کہ ہم اپنی زندگی اللہ تعالیٰ کو راضی کرتے ہوئے گزاریں گے اور اللہ کی طرف سے دی گئی وقت کی اس عظیم دولت کو ضائع نہیں کریں گے، ان شاءاللہ تعالیٰ!

بدل دو جہاں کو

ایک خوش گوار لمحہ! ایک یادگار انٹرویو!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

ایک بار پھر ایک عظیم ہستی کے انٹرویو کا موقع پا رہا ہوں۔ ایک انتہائی باہمت، بارُعب، باوقار اور عزت دار شخصیت۔ ہر چھوٹے بڑے سے محبت کرنے والے، ان کی عزت کرنے والے، انھیں چاہنے والے، ہر دل عزیز شخص۔ سوسائٹی کا ایک نایاب ہیرا اور قوم وملت کا قیمتی ترین جوہر۔

میرے والد محترم!

باقی باتیں ان شاء اللہ! انٹرویو کے ضمن میں آ ہی جائیں گی۔ بلا کسی تاخیر کے انٹرویو کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

محمد سعد: السلام علیکم، ابوجان! آپ کیسے ہیں؟

والد صاحب: الحمد للہ! اللہ کا شکر ہے۔

محمد سعد: ابوجان! سب سے پہلے آپ اپنا تعارف کروائیں۔

والد صاحب: جی بیٹا! میرا نام رفیق ہے۔ میرے والد صاحب کا نام حاجی سلیمان گاڈت ہے۔ مرحوم بہت نرم طبیعت کے حامل تھے۔ ہم پر بھی ان کی اس طبیعت کا بہت اثر ہے۔ میری پیدائش کراچی کے اولڈ سٹی ایریا میں ہوئی اور اِس وقت میری عمر ٦٦ سال ہے۔

محمد سعد: ماشاء اللہ! ابوجان اپنی اسکول کی زندگی کے بارے میں کچھ بتائیں۔

والد صاحب: بیٹا! میں نے LLB Part 1 تک تعلیم حاصل کی ہے، پھر میری شادی ہوگئی اور گھریلو مصروفیات میں مشغول ہوگیا۔

الحمدللہ! مجھے شروع سے اچھا ماحول ملا، اچھے گھرانے کے دوست ملے، جس کی وجہ سے اللہ پاک نے کئی بُرائیوں سے بچائے رکھا اور مختلف رفاہی کاموں میں حصہ لینے کا موقع فراہم کیا۔

محمد سعد: واہ! ابوجان! کیا بات ہے! لیکن ابوجان! اتنا روکھا سوکھا نہیں چلے گا، بچپن کا کوئی کارنامہ، کوئی شرارت بھی تو بیان کریں۔

والد صاحب: بیٹا! میں نے اسکاؤٹنگ بڑے شوق سے کی ہے۔

میں نے ۳ جمبوریوں میں حصہ لیا: کراچی، اسلام آباد اور ڈھاکا۔ (جمبوری، اسکاوٹ ٹریننگ کی ایک قسم کا نام ہے۔)

پھر میں رضا کارانہ طور پر ۱۹۷۴ء تک اس میں اوور کریو (over crew) کی حیثیت سے جڑا رہا۔

محمد سعد: واہ جی! واہ! یہ تو کافی دل چسپ ہوگا۔ آپ تو شروع ہی سے کافی پھرتیلے رہے ہیں۔ اچھا ابوجان! اپنی جوانی کا بھی کوئی کارنامہ بیان کریں۔

والد صاحب: میں ۲۰۰۰ء میں KMA (کتیانہ میمن ایسوسی ایشن) سے جڑا اور وہاں رفاہی کام کرنا شروع کیا۔ اب تک وہاں خدمات فراہم کر رہا ہوں۔ میری بنیادی ذمے داری تعلیم کے شعبے سے وابستہ رہی ہے۔ یہ ادارہ میری آنکھوں کے سامنے پھلا پھولا ہے۔ اس وقت اس میں ۶۰۰۰ سے زائد بچے بچیاں تعلیم حاصل کر رہے ہیں، مونٹیسری سے لے کر کالج تک کلاسیں ہیں، اس کی متعدد برانچیں ہیں۔ انتہائی معمولی سی فیس پر کھارادر اور میٹھادر جیسے علاقے میں واقع یہ ادارہ روشنی کی ایک کرن، بل کہ ایک چمکتا دمکتا ستارہ بن چکا ہے۔ کراچی کے ٹاپ ٹین اسکولوں میں اس کا نام ہے اور یہاں کے بچے بورڈ کے ساتھ ساتھ ملکی سطح پر منعقد کیے جانے والے مقابلوں

میں بھی پوزیشن حاصل کرتے ہیں۔

محمد سعد: یہ تو واقعی کارنامہ ہے اور آپ کی کھلی کرامت ہے۔کھنڈر میں خزانے کی مانند ہے۔ یقیناً آپ جواب دے دے کر تھک چکے ہوں گے، لیکن ہم بہت مستفید ہو رہے ہیں۔اور جو بھی یہ انٹرویو سنے گا یا پڑھے گا، وہ بھی بہت فائدہ محسوس کرے گا۔

اب میرا اگلا سوال آپ سے یہ ہے کہ آپ مجھے اپنی زندگی کا کوئی کارنامہ بتلائیں جس پر آپ کو فخر ہو۔

والد صاحب: میری زندگی کا کارنامہ میرا اِکلوتا بیٹا ہے، جو پہلے بیکن ہاؤس اسکول میں پڑھتا تھا، پھر یک دم وہ دین کی طرف آ گیا اور اُس نے عالم دین بننے کا ارادہ کیا اور اَب وہ عالم دین بننے کے بعد اَب مفتی کا کورس کر رہا ہے۔

میرا ماننا ہے کہ اولاد کو اُن کی خوشی کے مطابق کام کرنے دینا چاہیے۔اس میں ان کی اور ہم سب کی دنیا و آخرت کی بھلائی پنہاں ہے۔

محمد سعد: اچھا ابو جان! موجودہ حالات کے تناظر میں آپ کیا کہنا چاہیں گے، جب کہ کرونا وائرس کی وجہ سے بے شمار پریشانیوں نے جنم لے لیا ہے اور لوگ طرح طرح کی مصیبتوں کا شکار ہو چکے ہیں؟

والد صاحب: بیٹا! یہ تو ہمارے اعمال کی شامت ہے جو ہمارے سر لگی ہے۔ہمیں خوب توبہ و اِستغفار کرنے کی ضرورت ہے۔ایک ایک گناہ سے معافی مانگنی ہوگی اور اُسے چھوڑنے کا پورا عزم کرنا ہوگا۔

اپنے رب کائنات کی طرف متوجہ ہو کر اُسے پکارنا ہوگا کہ پروردگارِ عالم! ہمارے گناہ نہ دیکھیے، اپنی بے پناہ رحمت پر نظر کیجیے اور اپنے ان گناہ گار بندوں سے درگزر کر دیجیے۔بس ہمارے مانگنے کی دیر ہے، پھر دیکھیں، سب کچھ کس طرح بہتر ہو جائے گا۔

محمد سعد: ماشاء اللہ! آپ کی ہمت اور اللہ کی ذات پر توکل دیکھ کر اُمید بَر آتی ہے۔ ابو جان! ملک کی ترقی کے حوالے سے بتائیں، یہ قوم ترقی کی راہ پر کیسے گام زَن ہوسکتی ہے اور کیسے یہ ملک ترقی پذیر ممالک کی فہرست سے نکل کر ترقی یافتہ ملکوں کی فہرست میں شامل ہوسکتا ہے؟

والد صاحب: بیٹا! اس ملک کے لوگوں میں بہت ہنر ہے اور یہ قوم بہت محنتی قوم ہے۔ اسے بس درست راہ نمائی اور اچھی قیادت کی ضرورت ہے، پھر دیکھو یہ ملک کہاں سے کہاں نکل جائے گا۔

ان شاء اللہ! یہ وقت بھی آئے گا۔ مختلف تنظیمیں اور اِدارے کردار سازی پر کام کر رہے ہیں۔ من جملہ ان میں ایک بہترین ادارہ بیت السلام ہے۔ ان شاء اللہ ایک دن لوگ سیدھی راہ پر چلیں گے اور ترقی کی منازل طے کرتے نظر آئیں گے۔

محمد سعد: ابو جان! ساری دنیا میں مسلمان آباد ہیں۔ پہلے سارے مسلمان یک جا تھا، ایک خلیفہ کے تحت متحد تھے، اب نہ جانے کتنے ملکوں میں مسلمان تقسیم ہو چکے ہیں، یہ مسلمان ایک پلیٹ فارم پر کیسے جمع ہوں؟

والد صاحب: دو لفظ ہیں بیٹا! کلمہ طیبہ۔ صرف یہی ایک حل ہے۔ ہم کلمے کی ڈور کو پکڑ لیں۔ اسی میں کام یابی ہے۔ نفسا نفسی، اقتدار، مال و دولت، کرسی، ان سب کی ہوس کو ختم کرنا ہوگا اور کلمے کو بنیاد بنا کر ایک ہونا ہوگا۔

آج تک مسلمان نے جب بھی مار کھائی ہے اسی ہوس کی وجہ سے کھائی ہے۔ تاریخ کے اوراق اس بات کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔

محمد سعد: ابو جان! میں شروع سے یہ دیکھتا رہا ہوں کہ آپ ہر وقت لوگوں کو فائدہ پہنچانے کی فکر میں رہتے ہیں اور ہر وقت شہرت سے بچتے ہوئے بڑے بڑے کام سرانجام دیتے نظر آتے ہیں۔ سماجی کام میں آپ ہمیشہ دل چسپی لیتے رہے ہیں، یہاں تک کہ ایک میمن ادارے میں آپ کا اچھا خاصہ بڑا عہدہ ہے۔ اسکول، ہسپتال وغیرہ کے کاموں میں آپ کافی سرگرم ہیں۔ اسی بنیاد پر لوگ بھی

آپ کو بہت عزت دیتے ہیں، بل کہ آپ کی وجہ سے مجھے بھی عزت ملتی ہے۔ابو جان! رفاہی کاموں سے متعلق جاننا چاہوں گا، کیا اس میں اپنی صلاحیتیں لگانی چاہییں؟ اگر ہاں، تو اِس میں انسان کو کیا نیت کرنی چاہیے؟ کیا طریقۂ کار اپنانا چاہیے؟ اپنے چند تجربات سے بھی ہمیں آگاہ کیجیے۔

والد صاحب: بیٹا! کیوں نہیں، رفاہی کاموں میں ضرور لگنا چاہیے۔ مسلمان کی بھلائی کے لیے جہاں اور جو کام ملے، کرنا چاہیے۔

ہاں، ایمان داری، سچائی اور خلوص کو آنچل میں باندھ کر اِس کام میں لگے۔ محض اللہ کی رضا کو مقصود بنائے۔ شہرت اور نام و نمود سے اپنے آپ کو کوسوں دور رکھے۔ ذاتی مفاد حاصل کرنے کا تصور بھی ذہن میں نہیں آنے دے۔ بس خاموشی سے اپنے حصے کی مزدوری کر جائے۔ اسی میں اس کی دین و دنیا کی عزت ہے۔

محمد سعد: ابو جان! ایک اور چھوٹا سا سوال آپ کی خدمت میں پیش ہے۔ ہماری نوجوان نسل کیسے پھلے پھولے، ترقی کرے؟ رات کو دیر تک گھر سے باہر نہ رہے؟ اس حوالے سے والدین کیا کر سکتے ہیں؟ واعظین اور اَساتذۂ کرام کیا کردار اَدا کر سکتے ہیں؟

والد صاحب: تمام والدین چاہتے ہیں کہ ان کے بچے نیک بنیں، کام یاب ہوں۔ اصل بات اس میں ماحول کی ہے۔ میں نے جیسا کہ عرض کیا کہ مجھے اسکول سے اچھے ساتھی ملے، ہمارے وہ ساتھی آج بھی رفاہی کاموں میں جڑے ہیں، ان کی بھی لوگ بہت عزت کرتے ہیں۔

اگر دوست اچھے ہوں، تعلقات محدود ہوں اور گھر کا ماحول بنا ہوا ہو تو بچہ کہیں نہیں بھٹکے گا۔

محمد سعد: ابو جان! نو جوانوں کو آپ کوئی پیغام دینا چاہیں گے؟

والد صاحب: بس یہی پیغام ہے کہ ماحول قائم کرو، ماحول ڈھونڈو، اسے اپناؤ اور اُس اچھے ماحول کی چھاؤں میں اپنی زندگی بسر کرو۔

تعلیم کا ماحول۔ نیکی کا ماحول۔ یہ سب ضروری ہے۔ اس میں ہر کوئی دوسرے کا بازو بن جاتا

ہے اور خیر کے کاموں میں ایک دوسرے کی بھرپور معاونت ہوجاتی ہے۔

محمد سعد: ابو جان! اتنے عرصے بعد تو اِس طرح اطمینان کے ساتھ آپ کے ہمراہ بیٹھنا نصیب ہوا ہے۔ اب تو ایک نشست میں ہی سارے سوالات کرلیتا ہوں۔ ابو جان! یہ بتایئے کہ دین لوگوں کی زندگیوں میں کیسے آجائے؟

والد صاحب: بس اس کا حل مسجد ہی ہے۔ مسجد کی طرف رجوع کیا جائے اور مسجد کے ماحول کو اپنایا جائے۔ علمائے کرام سے فائدہ اٹھاتے رہنا چاہیے۔

محمد سعد: ابو جان! آپ بھی تجارت کے پیشے سے وابستہ ہیں۔ یہ بتایئے گا کہ تاجر برادران کس طرح شریعت کے مطابق تجارت کرنے لگیں، تجارتی ذمے داریاں اور اَخلاقیات اپنانے لگیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم جیسی مثالی تجارت کرنے لگیں۔ اس کے لیے کیا کرنا چاہیے؟

والد صاحب: بیٹا! یہ تو ہر ایک کو خود ہی کرنا ہوگا۔ انجام کو سوچ کر کام کرے گا، دیانت داری اپنائے گا اور جائز منافع لے گا تو وہ ترقی کرے گا۔ اس کی روزی میں برکت ہوگی، کام بابرکت ہوگا۔ مثلاً: اگر کوئی عیب ہو تو بتا کر اُسی حساب سے بیچے۔ اگر چھپا کر دے گا تو جب خریدار کو یہ بات معلوم ہوگی وہ اس سے نفرت کرنے لگے گا۔ رفتہ رفتہ اس تاجر کی عزت ملیامیٹ ہوجائے گی۔

محمد سعد: ابو جان! اب میں آخری سوال کے قریب آرہا ہوں۔ متعدد دینی شعبے کام کررہے ہیں: مساجد، مدارس، خانقاہ، دعوت و تبلیغ وغیرہ۔ ان کاموں میں ترقی کیسے ہو؟ لوگوں کا ان کی طرف رجحان کیسے بڑھے؟

والد صاحب: الحمدللہ! دین کا کام پھیل ہی رہا ہے۔ اس سے منسلک لوگوں کی تعداد میں اضافہ ہی ہورہا ہے۔

کرونا وائرس میں تبلیغی جماعت کو نشانہ بنایا گیا، انھیں تکلیف دی، لیکن یہ اللہ کے نیک بندے پیچھے نہیں ہٹنے والے۔ سر جوڑ کر محنت کررہے ہیں۔ ساری دنیا میں الحمدللہ دین پھیل رہا ہے اور

پھیل کر رہے گا۔ اللہ پاک ان شعبہ جات سے منسلک لوگوں کو جزائے خیر دے۔

محمد سعد: جزاکم اللہ خیراً! ابو جان! آپ کا انتہائی شکر گزار ہوں کہ آپ نے اپنا اتنا قیمتی وقت دیا۔ بس آپ سے ایک آخری گزارش ہے۔ اپنے قارئین و سامعین کو کوئی پیغام دینا چاہیں گے؟

والد صاحب: ایک بار پھر میں یہی عرض کروں گا۔ اچھے ماحول سے جڑ جائیں۔ نیک لوگوں کے ساتھ میل جول رکھیں۔ یہ میرا اِیمان اور قوی یقین ہے کہ اگر آپ اس بات پر عمل کر لیں گے، ان شاء اللہ! آپ کو کبھی کوئی تکلیف نہیں ہوگی اور اِس طرح ایک دن آئے گا کہ آپ پورے جہاں کو بدل دیں گے!

مضبوط رشتے

ہم بعض مرتبہ دنیا میں بہت سے لوگوں سے تعلق قائم کرنے میں تو کام یاب ہو جاتے ہیں، لیکن اپنے گھر والوں، خصوصاً اپنے والدین کے مقام و مرتبے کو پہچاننے سے قاصر رہتے ہیں۔

اگر دنیا کی محبتوں میں کوئی شخص یہ سمجھتا ہے کہ اس کے والد یا والدہ اس سے کم محبت کرتے ہیں تو یہ سمجھ لے کہ اس کے مقدر میں بس اتنی ہی محبت ہے، اس سے زیادہ محبت کوئی اس سے نہیں کرے گا۔

لہٰذا جو ہے اس پر شکر کرنا چاہیے اور والدین کی قدر دانی زیادہ کرنی چاہیے۔ ان کا حق زیادہ ہے۔ دنیا سے بڑھ کر اُن کی مزاج شناسی ضروری ہے۔ ان کے ساتھ رہ کر خوش و خرم رہنا سیکھنے سے بڑھ کر کوئی دولت نہیں۔ یہی اسلام ہے، یہی دین ہے۔

راہِ ہجرت

ہر مسلمان کی یہ آرزو ہوتی ہے کہ وہ سوئے حرم کا سفر کرے، خانۂ کعبہ کا دیدار کرے، روضۂ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر حاضری دے۔ وہاں جا کر اپنا دُکھڑا سنائے۔ اپنی والہانہ محبت اور اِیمانی جوش کا اظہار دربارِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر کرے۔ عاشق تو عاشق ہے، وہ تو بار بار حاضری کا آرزومند ہوتا ہے۔ ہر مرتبہ ایک نئی داستانِ محبت، ایک نئے انداز اور تازہ ترین جذبات لیے حرمین کا رُخ کرتا ہے۔

اور یقیناً اس دَر پر بلاوا پیسوں اور صلاحیت کو دیکھ کر نہیں ہوتا۔ اس کی سب سے بڑی دلیل یہی ہے کہ ہمیں وہاں زیادہ تر غریب یا متوسط طبقے کے لوگ نظر آتے ہیں۔ اسی طرح اس ناکارہ اور سیاہ کار کو بھی اللہ پاک نے چند مرتبہ حاضری کا شرف عطا کیا ہے۔ یہ خالص اسی کا فضل ہے، ورنہ ہمارے اعمال اس درجے کے نہیں ہیں۔

آخری مرتبہ کا عمرے کا سفر بھی دیگر اَسفار کی طرح یادگار اور بے مثال تھا۔ اس مرتبہ بندہ اپنے محترم والدین کے ساتھ ان کے خادم کی حیثیت سے گیا تھا۔ اور یہی نہیں، بل کہ وہاں اپنے مربی و شیخ حضرت جی مولانا شمس الرحمٰن صاحب دامت برکاتہم سے ملاقات بھی متوقع تھی۔ اس سے بڑھ کر میرے لیے کیا سعادت ہوسکتی تھی۔ میرے والدین بھی اور روحانی والد بھی، الحمدللہ! سفر میں دونوں سے فیض یاب ہونے اور اُن کی خدمت کا بھرپور موقع ملا۔ اگرچہ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ ان کا حق ادا کر پایا ہوں اور شاید ہی کبھی کہہ پاؤں گا۔

اس مرتبہ کے سفر میں میں نے یہ سوچا تھا کہ کیوں نہ نبوی دور کی ۲۳ سالہ تاریخ کو دُہرایا جائے۔ سیرت کی کتابوں سے وہ مقامات تلاش کیے جہاں آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا جانا اور ٹھہرنا ہوا

تھا۔ جن دروازوں سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم داخل ہوئے تھے، جن راستوں سے گزرے تھے، ان جگہوں پر سے گزرنے کی کوشش کی۔ غارِ حرا میں جہاں پہلی وحی نازل ہوئی تھی اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے تقریباً چھ مہینے وہاں عبادت کی تھی، وہاں جا کر میں نے بھی دو رکعت پڑھیں۔ میرا مقصد اِس میں ہرگز مہم جوئی نہ تھا اور نہ ہی میں کوئی غالی صوفی ہوں۔ نہ میں شریعت سے آگے بڑھ کر اپنی مرضی کے فضائل گڑھنے یا کسی چیز کو مقدس بنانے کا قائل ہوں۔ ہاں، اتنی بات ضرور ہے کہ یہ سفر محبت کا ہے، اس میں ضابطوں سے بڑھ کر دل کی کیفیت کو دیکھنا چاہیے۔

عاجز اُن مقامات پر جاتا رہا اور یہ سوچتا رہا کہ کیسے ان دشوار گزار راستوں سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا گزر ہوا ہوگا اور اُس وقت آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر کیا بیتی ہوگی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اکیلے، تن تنہا اس راستے کا سفر شروع کرتے ہیں۔ اپنے گھر کو، پھر خاندان اور پھر قبیلے کو دعوت دیتے ہیں۔ اس کے بعد پھر جزیرۂ عرب اور بیرونِ عرب دنیا کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ نبوت ملنے کے بعد تیرہ سال مکے میں کس طرح گزرتے ہیں، انسان تو بس تصور ہی کر سکتا ہے۔ آقا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے دل ہی دل میں مخاطب ہو کر نم دیدہ آنکھوں سے پوچھ ہی سکتا ہے کہ جب سب لوگ آپ کی مخالفت پر اُتر آئے اور جو جتنے اپنے تھے، اتنا ہی ان کی طرف سے غم سہنا پڑا، اس وقت آپ پر کیا گزری تھی۔ کن جذبات کے ساتھ اور نہ جانے کن حکمتوں کے تحت آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اپنی زندگی کے مختلف فیصلے کیے ہوں گے اور اپنے جاں نثار صحابہ رضی اللہ عنہم کی جماعت کو اُن پر چلایا ہوگا۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی زندگی کا ہر دور سبق آموز بھی ہے اور قابلِ عبرت بھی، لیکن اسے سمجھنے کے لیے کتابوں کے ساتھ ساتھ اپنے تصور کی آنکھ کو بیدار کرنا بھی ضروری ہے۔

غارِ حراء پر چڑھنے کے لیے ایک دن میں نے اپنے ہوٹل سے صبح سویرے روانہ ہونے کا قصد کیا۔ شروع سے ہی صبح نہ سونے کی عادت رہی ہے۔ پہلے والدین کو فجر کی نماز کے بعد ہوٹل پہنچا کر واپس سڑک پر آیا اور ''سیارہ سیارہ'' پکارنے لگا۔ ایک ٹیکسی والا متوجہ ہوا، میں نے اس

سے ''غارِ حراء'' جانے کا کہا۔ اس طرح تنِ تنہا، غور و تدبر میں شرابور، دنیا سے بے خبر غارِ حراء پہنچ گیا۔ وہ شہر اگرچہ میرے لیے ایک اجنبی شہر ہے، لیکن اتنا بھی اجنبی نہیں۔ میری روح، میرا قلب و جگر، سب کچھ حرمین سے وابستہ ہے اور رہے گا۔

اِس وقت وہاں پہاڑ پر چڑھنے کے لیے باقاعدہ پہاڑ تراش کر سیڑھیاں بنا دی گئی ہیں۔ میں موجودہ سہولیات کے باوجود تین مرتبہ ٹھہر کر ہی اوپر چڑھ پایا۔ حیران تھا کہ ماشاءاللہ! کتنے لوگ وہاں پہنچے ہوئے ہیں اور ہمارے پاکستانی بھائی تو وہاں پہنچ کر بھی کاروبار کر رہے ہیں۔ چند ایسے بھی تھے جو بھیک مانگ رہے تھے۔ یہ دیکھ کر اور زیادہ تعجب ہوا۔ ویسے بھی اور خاص طور پر ایسے مقدس مقامات پر کسی کے متعلق بدگمانی دل میں لانا مناسب نہ تھا۔ میں نے یہ دعا پڑھی:

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ عَافَانِیْ مِمَّا ابْتَلَاهُ بِهٖ وَ فَضَّلَنِیْ عَلٰی كَثِیْرٍ مِّمَّنْ خَلَقَ تَفْضِیْلًا۔ اور اپنے مقصد کے متعلق سوچنے لگا۔

آقا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی محبت دل میں کیسے نہ بیٹھے۔ بس آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو سوچتا رہا، روتا رہا اور اُوپر چڑھتا رہا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کس طرح اکیلے ساز و سامان سمیت اوپر چڑھتے ہوں گے اور آخر وہ کیا جذبات ہوں گے جنھیں دل میں لیے آپ اتنی مشقت برداشت کرنے میں ہی اپنے لیے سکون دیکھتے ہوں گے۔ اوپر چڑھنے کے بعد دیکھا کہ ایک اور پتلا سا راستہ ہے، ایک غار ہے جو جانبین سے کھلا ہوا ہے، اس میں سے سکڑتے ہوئے گزرتے ہیں۔ اس سے گزرنے کے بعد ایک کشادہ سی جگہ آتی ہے، اسی میں غارِ حرا ہے۔ غارِ حرا خود اِتنا ہی ہے کہ ایک آدمی اس میں نماز ادا کر سکے۔ وہ آر پار نہیں۔ وہاں بھی مختلف ممالک کے عاشقین کا ہجوم تھا۔ کچھ انتظار کے بعد مجھے بھی غارِ حرا میں دو رکعت ادا کرنے کا موقع ملا۔ دو رکعت ادا کیں اور پیچھے ہٹ گیا۔

وہاں سے مسجد حرم کے میناروں کا نظارہ کرتا رہا اور خیالوں میں گم سوچتا رہا۔ یہ وہ مقام ہے جہاں سے دین اسلام کا آغاز ہوا، وحی کی ابتدا ہوئی اور پہلی مرتبہ جہان والوں کو قرآن کریم جیسی مقدس

کتاب سے فیض ملا، جو کہ اب تک سورۂ علق کی پہلی پانچ آیتوں میں موجود ہے۔ یہ سب دیکھ کر اِس بات پر یقین پختہ ہو جاتا ہے کہ یہ دین ہم تک اتنی آسانی سے نہیں پہنچا۔ ہاں، یہ ضرور ہے کہ ہر دور میں اسے آسان سے آسان اور زیادہ سے زیادہ باسہولت طریقے سے لوگوں کو پہنچانے اور سمجھانے کی کوشش مسلسل جاری رہی ہے اور علمِ دین کو اُمت میں باقی رکھنے کی محنت کبھی کم نہیں ہوئی۔ اللہ پاک سب کو اِس کی قدردانی کی توفیق نصیب فرمائے۔

ان مواقع کا دورہ کرنا ثواب ہو یا نہ ہو، لیکن اگر صحیح جذبات کے ساتھ کیا جائے اور خصوصاً اکیلے کیا جائے تو اِس سے بے حد فائدہ ہوتا ہے۔ خود شناسی (Self Recognition) ہوتی ہے، نیز خود شناسی سے خدا شناسی تک کا سفر طے کرنے میں معاونت بھی ملتی ہے اور تمام دین کی محنتوں کا خلاصہ بھی یہی ہے کہ ہر انسان خود اللہ کو پہچان لے۔ أن تعبد الله كانك تراه کی کیفیت اسے حاصل ہو جائے۔ جب وہ عبادت کرے تو یوں محسوس ہو کہ وہ اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہا ہے۔

حیرت انگیز جذبات اور نت نئے احساسات کے ساتھ میں وہاں سے واپس آیا اور اِسی طرح دوسرے مقامات کا سفر جاری رکھا۔ منیٰ کے پاس حج کے ایام میں عکاظ، مجنہ، ذوالمجاز نامی جن بازاروں میں جا کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پورے جزیرۂ عرب سے آنے والے لوگوں کو دعوت دیتے تھے اور وہیں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خاندان کے افراد گھات لگائے بیٹھے ہوتے تھے اور کہتے تھے کہ اس کی نہ مانو، یہ جادوگر ہے۔ نہ جانے سینے میں کتنے نشتر لیے اور غم سہتے ہوئے آپ دعوت جاری رکھتے ہوں گے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اتنی بڑی ہستی اور اِتنا بلند آپ کا مقام و مرتبہ، بادشاہوں کے بادشاہ بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو چاہنے والے، فرشتے، جنات، سب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تابع، بے جان و بے زبان مخلوق، سب آپ کے دیوانے، لیکن اس کے باوجود دِین کی دعوت کی خاطر اپنی ہستی کو مٹاتے اور اپنے مقام و مرتبے کو بھلاتے نظر آ رہے ہیں۔ ہر موقع پر صرف اور صرف اللہ کا دین پیشِ نظر ہے۔

اسی طرح کا ایک یادگار واقعہ یہ بنا کہ اس مرتبہ حاضریِ درِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے بھی میرے

دل نے ایک نئی راہ اختیار کی۔ دماغ بھی اس کے ہم راہ ہوا اور گھر والوں کو بھی اپنے موافق کر ہی لیا۔ دماغ کو ہم راہ کرنے کی وجہ یہ تھی کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ ہجرت کا ارادہ کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے غم فراقِ مکہ اور مسرتِ وصالِ مدینہ کے ساتھ ساتھ تدبیر کو بھی اپنی بابرکت صحبت سے نوازا۔

کفار کے شر سے بچنے کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینے جانے کا راستہ بدل دیا تھا۔ اس دور میں جس راستے سے مدینہ منورہ کا سفر کیا جاتا تھا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سے بالکل مختلف راستہ اختیار کیا۔ اگر نقشوں میں دونوں راستوں کو دیکھا جائے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ دونوں راستے آپس میں آنکھ مچولی کھیل رہے ہیں۔ راستے بالکل ہی الگ ہیں۔ صرف چار مقامات پر ایک دوسرے سے ملاقات کرتے نظر آتے ہیں: بطنِ مر پر اور املج، مشلل اور جُحفہ مقام سے کچھ پہلے۔ یہ جو راستہ ہے اس میں پہلے غار ثور جاتے ہیں، جو کہ مدینے سے بالکل مخالف سمت میں ہے، پھر وہاں سے مقام حدیبیہ پہنچتے ہیں اور صحیح معنوں میں مدینہ منورہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ راستے میں بطنِ مر، عسفان، خیمۂ ام معبد، رابغ اور اِس طرح متعدد دیگر مقامات سے گزر ہوتا ہے، پھر مسجد قباء اور وہاں سے آدمی مسجد نبوی تک پہنچ جاتا ہے۔ اس کا نقشہ بآسانی انٹرنیٹ سے حاصل کیا جا سکتا ہے، صرف ''Hijrat from Makka to Madina'' لکھ کر تلاش کریں، نقشہ آپ کے سامنے ہوگا۔ ساتھ یہ بھی بتا دوں کہ ہمارا اُستاد، گوگل بھی عجیب ہے۔ بعض مرتبہ عربی میں تلاش کرو تو صحیح نتیجہ دکھاتا ہے تو کبھی انگریزی میں تلاش کرنے سے اور کبھی دونوں کو ملا کر لکھنے سے صحیح نتیجہ حاصل ہوتا ہے۔ موجودہ دور میں ایک موٹروے بنا دیا گیا ہے جس سے سفر کافی آسان ہو گیا ہے۔ یہ تحقیق نہیں ہے کہ آیا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور میں جو عام راستہ تھا، یہ موٹروے بھی اسی راستے پر بنایا گیا ہے یا اس سے ہٹ کر بنا ہے، البتہ اب عام راستہ وہی ہے۔ پبلک ٹرانسپورٹ تو چلتی ہی یہیں سے ہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ کچھ اس میں قدیم راستے کو لیا ہے اور کچھ اس سے الگ ہے۔

جس دن مدینہ منورہ روانہ ہونا تھا اسی رات ایک اچھے پاکستانی پرائیویٹ ٹیکسی ڈرائیور سے فون پر بات ہوئی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ کیا اُسے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہجرت والا راستہ معلوم ہے۔

''ہاں، سب معلوم ہے، آپ جہاں سے بولیں گے وہاں سے لے جاؤں گا۔'' یہ کہہ کر اُس نے مجھے راضی کرنے کی کوشش کی۔ انھیں بھی اندازہ ہے کہ زائرین طرح طرح کے جذبات لے کر آتے ہیں اور مختلف طرح کی باتیں کرتے ہیں۔ یہ لوگ سن تو سب کی لیتے ہیں، لیکن کرتے اپنی ہی ہیں، پھر میں نے اسے واٹس ایپ پر نقشے کی تصویر روانہ کی اور ساتھ زبانی پیغام بھی بھیجا کہ اس راستے سے ہی جانا ہے۔ کچھ دیر بعد میں نے اسے فون کیا اور کافی لمبی گفتگو ہوئی اور جیسا کہ میرا اندازہ تھا، وہ واقعی پہلی مرتبہ ہامی بھرتے وقت بات سمجھا نہ تھا۔ اس کا نام کاشف ہے۔ پنجاب سے اس کا تعلق ہے اور وہ بہت ہی دریا دل انسان ہے۔ آج بھی کبھی کبھار واٹس ایپ پر اُس سے سلام دعا ہو جاتی ہے۔

وہ مان گیا اور کہنے لگا کہ عام راستے میں تقریباً چار گھنٹے لگتے ہیں، اس میں ساڑھے پانچ سے چھے گھنٹے لگیں گے اور میں آپ کی خاطر صرف ۵۵۰ ریال لوں گا، یعنی صرف ۱۰۰ ریال زیادہ۔ میں نے خوشی سے ہامی بھر لی اور اِس بات کا روانگی تک میرے علاوہ کسی کو بھی علم نہ تھا، والدین کو بھی نہیں۔ انھیں صرف یہ علم تھا کہ اتنے میں گاڑی بک ہوئی ہے اور بس! نہ بتانے کی دو وجوہات تھیں: ان کی ''نہ'' سے بچ جاؤں اور دوسرا، انھیں ایک انوکھا سرپرائز بھی دے سکوں۔

چناں چہ اگلے روز صبح سویرے گاڑی آئی، سامان لوڈ کیا اور ہم اس میں ایک بہترین ٹیکسی ڈرائیور کے ساتھ روانہ ہو گئے۔ اس کے پاس نعتوں اور باتوں، دونوں کا ذخیرہ تھا اور مسلسل مجھے مقامات کے نام بتاتا اور یہ یقین دہانی کرتا کہ وہ اسی راستے سے لے کر جا رہا ہے جس کا نقشہ میں نے اسے دیا تھا۔ میں بھی خوش اور والد صاحب بھی خوش۔

اس راستے میں ویسے کسی خاص تاریخی مقام سے متعلق مجھے دیکھنے یا سننے کو نہیں ملا۔ سوائے اس

کے کہ ہمیں ام معبد کے خیمے کا مقام دیکھنا نصیب ہوا جو اَب بھی خالی زمین ہی تھا۔ اس کا کوئی صحیح نشان نہ تھا۔ ام معبد رضی اللہ عنہا وہ خاتون ہیں جن کے خیمے کے پاس آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ٹھہرے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھوک لگ رہی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ام معبد کے گھر آ کر کھانے کا پوچھتے ہیں اور اِس میں کوئی عیب بھی نہیں۔ مہمان نوازی تو مہمان کا حق ہوتا ہے۔ بہر حال، وہ کہہ دیتی ہیں کہ میرے پاس ایک کمزور بکری کے علاوہ کچھ نہیں، جو دودھ دینے سے عاجز ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہاتھ لگنے کی دیر تھی اور اُس کے تھن دودھ سے بھر گئے۔ ام معبد رضی اللہ عنہا بھی اس دودھ سے سیر ہوئیں اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی اس سے دودھ نوش فرمایا۔ بعد میں مسلمان ہونے والی اس بے مثال خاتون کی سیرت کے اوراق میں شہرت کی وجہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے اس موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حلیہ بیان کا ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چلے جانے کے بعد اُن کے شوہر آئے۔ بکری کی کیفیت دیکھ کر حیران ہوئے۔ بتایا گیا کہ ایک شخص آئے تھے۔ شوہر سمجھ گئے کہ یہ وہی قریشی خاندان کے فرد ہیں جن کے پیچھے ان کی قوم ہاتھ دھو کر پڑی ہے۔ انھوں نے کہا کہ ان کا حلیہ بیان کرو۔ چناں چہ انھوں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حلیہ اپنے شوہر کو سنایا اور واقعی اس دیہاتی خاتون نے کیا کمال کیا! فصاحت و بلاغت کے سمندر بہا دیے۔ (کبھی موقع ہوا تو اِس پر روشنی ڈالیں گے، ورنہ زاد المعاد اور الرحیق المختوم نامی سیرت طیبہ کی دو مشہور کتابیں دیکھ لیں۔) بعد میں یہ جوڑا مدینہ منورہ آیا اور آغوشِ اسلام میں داخل ہوا۔

اس راستے کی سب سے پہلی خصوصیت تو یہی تھی اور ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ اسی راستے کے ذریعے ہجرت فرمائی تھی اور میرا مقصد بھی اس راستے سے سفر کرنے کا یہی تھا کہ میں اپنی ماضی کی غفلتوں سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ جیسے بابرکت دل نشین شہر میں آ پہنچوں اور اپنے دل کی دنیا کو آباد کرلوں۔ پہلے جلال کے جلوے دیکھوں، پھر جمال کے مناظر سے دل خوش کروں۔ میں اُس ہجرت کے ساتھ ایک اور ہجرت کو جوڑنے کا طلب گار تھا جس کا تعلق میری اپنی ذات سے تھا۔ ؎

صحرا میں کڑی دھوپ کا ڈر ہوتے ہوئے بھی
سائے سے گریزاں ہوں شجر ہوتے ہوئے بھی

اس کے علاوہ ایک اور خصوصیت جو اِس راستے میں مجھے نظر آئی وہ یہ تھی کہ اس راستے کے دونوں جانب پہاڑ ہی پہاڑ تھے، چٹانیں ہی چٹانیں تھیں یا پھر مٹی کے غیر معمولی حجم کے تودے تھے، وہ بھی بھورے کم، کالے رنگ کے زیادہ تھے، گویا کہ انھیں کسی نے جلا دیا ہو۔ ہر طرف کالی اور بھوری مٹی کے تودے اور بیچ میں ہماری فل اے۔سی گاڑی، جو اِس لق و دق صحرا کو پار کر رہی تھی۔ ایک الگ ہی منظر تھا۔ اسے سب سے اچھا وہی دیکھ سکتا ہوگا جو کسی جہاز یا ہیلی کاپٹر میں بیٹھ کر اُوپر سے نظارہ کرے۔

آگے پھر اس کے لق و دق صحرا
کہ نہ جس میں تھا آب اور نہ گیاہ

میرا جی چاہا کہ میں اس شعر کو یوں عرض کروں: ؎

آگے پھر اس کے لق و دق صحرا
کہ ہے جس میں بھی آب اور ہے گیاہ

کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اس صحرا سے پیچھے بھی مکمل غذائیت کا سامان موجود تھا اور آگے جو صحرا ہے، اس میں ہماری روحانیت کا توشہ بخوبی موجود ہے۔ کیا ہی وہ ایام تھے اور کتنے ہی دل کش نظارے تھے! قدرت کے ان عجائبات پر تعجب ہو رہا تھا اور عرب کی کڑی دھوپ پر بھی۔ مٹی تک کو اُس نے جلا دیا، ورنہ مٹی تو وہ شے ہے جو 1000 (°C) ڈگری سیلسیس پر جا کر پگھلتی ہے، حالاں کہ پانی 100 (°C) ڈگری پر بھاپ بن جاتا ہے۔

ہمارے ڈرائیور صاحب فرمانے لگے:

”کہتے ہیں کہ اس مقام پر کسی سابقہ قوم پر عذاب آیا تھا اور یہ اسی کی علامات ہیں۔“

اللہ ہی بہتر جانتا ہے، مگر میرا خیال نہیں ہے کہ ایسا ہوا ہوگا۔ کم از کم نبی اکرم ﷺ کے علاوہ جن پچیس انبیائے کرام علیہم السلام کا تذکرہ قرآن مجید میں نام سے آیا ہے، ان کا اس علاقے سے تعلق ہونا بہت بعید معلوم ہوتا ہے۔ قوم ثمود کا مقام شمال کی طرف مدینے سے بھی آگے تبوک کے قریب ہے اور قومِ عاد کا علاقہ آج کل عمان میں آتا ہے۔ اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو شاید آپ ﷺ اس راستے کو اِختیار ہی نہ کرتے۔ تبوک جاتے وقت آپ ﷺ نے قومِ ثمود کی بستیوں پر سے بھی تیزی سے گزرنے کا کہا تھا اور وہاں کا پانی استعمال کرنے کی بھی اجازت نہ دی تھی۔ زیادہ صحیح بات جو معلوم ہوتی ہے اور جس کی اب ڈرائیور نے بھی کسی سے معلوم کر کے تصدیق کر دی، وہ یہ ہے کہ یہ دراصل اس آگ کے اثرات تھے جس کے آنے کا تذکرہ احادیث مبارکہ میں ملتا ہے اور محدثین کرام کتاب الفتن میں اسے ذکر فرماتے ہیں۔

۶۵۴ھ میں یہ آگ وسط حجاز میں بھڑکی تھی اور ہوتے ہوتے مدینہ منورہ کے قریب تک آ گئی تھی اور مدینے سے دس کلومیٹر قبل تک پہنچ کر تھم گئی تھی۔ آج بھی اس کے اثرات دیکھے جا سکتے ہیں اور آپ ﷺ کے مبارک ارشادات کی تصدیق کی جا سکتی ہے۔

ڈرائیور ابو سے باتیں کرتے ہوئے کہنے لگا:

”آپ کا بیٹا بڑا اللہ والا ہے۔ میں روزانہ مکہ و مدینہ جاتا رہتا ہوں۔ پہلی مرتبہ زندگی میں یہ راستہ اختیار کر رہا ہوں۔ اس طرح سیدھے راستے کو چھوڑ کر بار بار گاڑی گھما گھما کر کوئی نہیں کہیں جاتا! میں نے اپنے ڈیرے میں موجود جب ساتھیوں کو نقشہ دکھایا تو سب ہنسنے لگے اور کوئی اس پر جانے کے لیے راضی نہ ہوا۔ میں بھی خاموش ہو گیا کہ اتنے میں ان کا فون دوبارہ آ گیا۔ میں نے کہا:

کمانے کے لیے زندگی باقی ہے، یہ واقعی کوئی بڑی چیز ہے، زیادہ پیسے اور وقت دونوں دینے کے لیے تیار ہے اور میں تیار ہو گیا۔“

والد صاحب نے بھی مسکراتے ہوئے یہی کہا:

"ہاں، بس اللہ پاک اسے تھوڑا اٹھنڈا کر دے۔ بہت جذباتی ہے!"

بہرحال، سب ہی اس راستے سے مستفید ہو رہے تھے۔ مناظر کا لطف اور برکات، دونوں ہی سمیٹ رہے تھے۔ بعد میں جس جس کو بتایا، اس نے بھی تعجب انگیز خوشی کا اظہار کیا۔

ایک موقع پر ڈرائیور نے مجھے کہا: آپ کو بدر لے جاتا ہوں اور پورا بدر دکھاتا ہوں۔ میں نے انکار کر دیا اور کہا کہ ہم ہجرت کے راستے سے ہٹ کر عام راستے پر نکل جائیں گے۔ پہلے بدر جا چکا ہوں اور اِن شاء اللہ! موقع ملا تو پھر سہی، البتہ کچھ آگے جانے کے بعد ایک مرتبہ پھر اِس طرح کی پیش کش ہوئی۔ بیر روحاء قریب تھا۔ مدینے سے تقریباً اسّی کلومیٹر پہلے پرانی سڑک کے دائیں جانب بیر روحاء، یعنی روحاء کا کنواں ہے۔

یہ وہ جگہ ہے جہاں غزوۂ بدر کے موقع پر لشکر نبوی نے پڑاؤ ڈالا تھا۔ اس کنویں کے حوالے سے تاریخی کتابوں میں کئی روایات ہیں۔ ایک روایت میں ہے کہ لشکر نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں شامل ایک صحابی کو گردے کا شدید درد ہوا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بیر روحاء کے کنویں کا پانی پلایا تو اُنھیں آرام آ گیا۔ مقامی لوگ اس پانی کو آبِ شفا کہتے ہیں۔ وہ بھی راہِ ہجرت سے منحرف تھا اور عام راستے پر واقع تھا۔ اس پر بھی اس نے پیش کش کی۔ والدہ محترمہ کی چاہت پر میں نے یہ پیش کش قبول کر لی۔ بس ایک موڑ تھا اور ہم بیر روحاء پر تھے۔

وہاں ٹھہرے، ایک دیہاتی سے عربی میں زور آزمائی کی۔ انھیں ہماری اردو زبان میں بدو کہتے ہیں۔ میں نے اس سے مل کر یہ سمجھنے کی کوشش کی کہ کیا واقعی یہ عام عربوں سے زیادہ فصیح ہوتے ہیں اور ساتھ زیادہ ضدی اور غیر تہذیب یافتہ بھی۔ بات واقعی ایسی ہی تھی۔ اس پر مزید یہ بھی جان لیں کہ ڈرائیور صاحب نے بتایا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور میں جو دیہاتی تھے، اب بھی پائے جانے والے دیہاتی لوگ ان ہی کی نسل سے ہیں۔ صدیاں گزر جانے کے بعد بھی یہ ویسے کے ویسے ہی ہیں۔ نہ انھیں کوئی کچھ کہتا ہے اور نہ یہ کسی سے کچھ کہتے ہیں۔ دیہاتی کے لب و لہجے

اور اَنداز سے تو یہی معلوم ہوتا تھا۔ کہتا تھا کہ ''أنا الأعراب! أنا الأعرابی'' میں دیہاتی ہوں! میں دیہاتی ہوں! اور اعرابیوں، یعنی دیہاتیوں سے متعلق قرآن مجید کی آیتیں پڑھ پڑھ کر اپنے ٹھیٹھ عربی لہجے میں سناتا تھا۔

چھوٹتے ہی پہلا دعویٰ اس نے مجھ پر یہ دائر کیا کہ تم یہاں مال کمانے کے لیے آئے ہو، پیسا چاہیے تمھیں! میں نے اسے تسلی دی کہ نہیں بھائی! کوئی دنیاوی مقصد نہیں ہے۔ صرف اور صرف عمرے کے لیے اور روضۂ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی زیارت کے لیے آئے ہیں، تاکہ ہماری آخرت سنور جائے۔ یہ میرے ابو ہیں اور میری امّی گاڑی میں بیٹھی ہوئی ہیں۔ اس بات سے وہ بہت خوش ہوا اور میری نیم فصیح عربی سے بھی کافی متاثر ہوا۔ میں اس کی بات کافی مشکل سے سمجھ رہا تھا، لیکن وہ میری بات فوراً سمجھ جاتا۔ اس سے یا تو یہ معنی لیا جائے کہ میں اس عرب دیہاتی سے زیادہ فصیح ہوں یا بس یوں سمجھ لیا جائے کہ میں آہستہ اور سادی سی عربی بول رہا تھا، نہ کوئی چٹخارے دار لہجہ تھا اور نہ ہی کوئی محاورے۔ اسی پر اُس سے الوداع ہوا اور پھر آئندہ دنیا میں کبھی نہ ملنے کا عزم کر کے گاڑی میں بیٹھ گیا۔ پانی تو میں نے پہلے ہی خرید لیا تھا۔ اس کنویں کا بابرکت پانی گیلن میں دست یاب تھا، کنویں سے خود نکالنے کی کوئی صورت نہ تھی۔

اس دیہاتی سے ملنے کا بھی بہت فائدہ ہوا۔ ایک فائدہ تو یہ ہے کہ کئی باتوں کی تصدیق ہوگئی۔ دوسرا یہ کہ کل اپنے متعلقین سے یہ تو کہہ سکوں گا کہ میں نے بدو سے ملاقات کی ہے۔ تیسرا بڑا فائدہ یہ ہوا کہ میں سمجھ گیا کہ حرمین مال کمانے کے لیے آنے کی جگہ نہیں۔ جب ہم وہاں زائر کی حیثیت سے جاتے ہیں تو بادشاہ کے بھی عزیز ہوتے ہیں اور جب مال کی خاطر وہاں کا رُخ کرتے ہیں تو جاہل دیہاتی کی نگاہ سے بھی گر جاتے ہیں۔

آخر کار قسمت ہمارے ہم رکاب ہوئی، سرکارِ دو جہاں صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم سے بلاوا آ گیا اور ایک بار پھر حضرت سعید احمد خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی نعت ''محمد (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم) کا روضہ قریب آ رہا ہے'' بھائی جنید

جمشید مرحوم کی سریلی آواز میں سنتے سنتے اور درود شریف پڑھتے پڑھتے ہم مدینہ منورہ پہنچ گئے۔ ہاں، راستے میں کچھ پنجابی نعتیں سننے کا بھی اتفاق ہو گیا۔ اگرچہ راہِ ہجرت میں قباء کا قیام بھی شامل تھا، لیکن والدین انتہائی زیادہ تھک چکے تھے، عمر بھی ان کی زیادہ ہے۔ بس ان کی شفقت، محبت اور بلا مبالغہ اپنے اکلوتے بیٹے کے ساتھ بے انتہا لاڈ و پیار ہے جو اِتنا سب کچھ کر لیتے ہیں۔

ہم وہاں سے گزرتے ہوئے ہوٹل آ گئے۔ کاشف بھائی کو اُن کا حقِ خدمت دیتے ہوئے وداع کیا اور اپنے ہوٹل میں آ پہنچے۔ کچھ آرام کیا، پھر نماز کی تیاری کی اور مغرب کی نماز میں ہم مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دل کش فضا میں داخل ہو گئے۔

شاعر نے کیا خوب کہا ہے: ؎

تیرا ذرہ ذرہ نشانِ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہے
فدا تجھ پر میں ، اے خاکِ شہرِ مدینہ!

آگے کے جذبات زیرِ قلم نہیں لائے جا سکتے۔ ان کا تعلق ہی زبان و بیان سے نہیں ہے۔ بس میری دعا ہے کہ اللہ پاک ہر مسلمان کو عموماً اور مجھ سے تعلق رکھنے والے اور اِس تحریر کو پڑھنے والے کو خصوصاً اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دَر ضرور دکھائے، آمین! اور جس راستے سے میں مدینہ منورہ گیا، اس راستے سے وہاں جانا بھی ضروری نہیں، البتہ اگر جا کر دیکھیں تو اُمید ہے کہ ان شاء اللہ! خالی ہاتھ واپس نہیں آئیں گے۔

یہ چمن ہمیشہ آسودہ حال رہے گا

ذرائع ابلاغ میں تحریر کا مقام

ابلاغ وتشہیر کے جتنے بھی ذرائع ہوں اور اُن میں اضافہ بھی ہوتا رہے، ان کی اصل، تحریر کی صورت میں باقی رہے گی۔ تمام قدیم وجدید ذرائع ابلاغ میں کتاب یا کاغذ جتنا مؤثر اور پُراثر ذریعہ تھا اور ہے، وہ ہمیشہ رہے گا۔ اگر زمانہ قدیم میں کتاب اور کاغذ اکیلا وتنہا ذریعہ ابلاغ ہونے کی وجہ سے اہم گردانے جاتے رہے ہیں تو آج ذرائع ابلاغ کے ہجوم میں بھی کتاب یا تحریر کی اہمیت وحیثیت مسلّم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی جوں جوں سائنسی ترقی ہورہی ہے توں توں کتاب کی طباعت و اِشاعت کے فن میں بھی چار چاند لگتے جارہے ہیں اور مجموعی طور پر کتاب کی تعدادِ اشاعت میں اضافہ ہو رہا ہے۔

موجودہ دور اور فن تحریر:

آج کے فتنہ پرَوَر دور میں کتاب یا رسالہ، ایک نہایت مؤثر اور جائز ذریعہ ابلاغ و اِشاعت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گزشتہ چند عشروں سے علمائے حق نے کتب، رسائل اور اَخبارات کے ذریعے اسلامی تعلیمات کی ترویج وتبلیغ کے کام کو مستقل بنیادوں پر آگے بڑھایا اور پھیلایا ہے۔ چناں چہ کسی بھی قسم کی دینی تحریر، خواہ اس کا موضوع کچھ بھی ہو، لکھتے وقت لکھنے والے کو اُسے کارِثواب سمجھتے ہوئے اللہ کی رضا، خلوصِ نیت، پوری توجہ و اِنہماک اور اُصول وقواعد کی پابندی کرتے ہوئے تحریر کرنا چاہیے۔ تحریر ایک نازک اور مقدس عمل ہے۔ یہ قوم کے مزاج اور سوچ

کی راہ نما ہے۔ تحریر قلم کی امانت ہے۔ چناں چہ تحریر خواہ رسالے کے لیے ہو، اخبار کے لیے ہو، انٹرنیٹ کے لیے ہو یا آپ کوئی کتاب لکھ رہے ہوں، اُس کا موضوع کچھ بھی ہو، تحریر کو پورے اہتمام، توجہ اور واضح مقصد کے ساتھ لکھنا چاہیے۔

جو ہر پل میرے روبرو ہے

شاعرمدبر، شاعرعاشق علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے دن نے ایک بار پھر مجھے بیدار کر دیا۔ میں یاد کر بیٹھا کہ ہم بحیثیت انسان، بحیثیت مردِ مومن جو زندگی بسر کر رہے ہیں وہ صحیح سمت میں گام زن بھی ہے یا نہیں؟

انسانی فطرت ایسی مثال کی تلاش میں رہتی ہے جسے وہ اپنا آئیڈیل بنالے اور اُس کی اتباع کرے۔ کام یاب ادارے بھی اپنے لیے آئیڈیل مثالیں اور پالیسیاں تلاش کرتے ہیں۔ ان میں اگر کوئی بے مثال آئیڈیل تلاش کرنا چاہے، الوہی پالیسیوں کا متلاشی ہو تو تلاش بسیار کے بعد وہ ذکر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہی پہنچے گا اور یہی کہنے پر مجبور ہوگا کہ ان کا مثل کوئی تھا، نہ ہے اور نہ ہوگا۔

شاعر صبیح رحمانی اپنے مقبول نعتیہ اشعار میں فرماتے ہیں:

کوئی مثلِ مصطفیٰ کا کبھی تھا ، نہ ہے ، نہ ہوگا
کسی اور کا یہ رتبہ کبھی تھا ، نہ ہے ، نہ ہوگا
اُنھیں خلق کر کے نازاں ہوا خود ہی دستِ قدرت
کوئی شاہ کار ایسا کبھی تھا ، نہ ہے ، نہ ہوگا

مشہور فلسفی شاعر ٹیگور سے کسی نے پوچھا کہ برہمو سماج کی ناکامی کی کیا وجہ ہے؟ حالاں کہ وہ مذہب عدل واِنصاف اور صلح پسندی کی باتوں سے بھرا ہوا ہے۔ اس کا جواب یہی تھا کہ ان کے پاس کسی کامل شخصیت کی عملی زندگی نہ تھی۔

دوستو! دنیا بیماریوں سے بھری پڑی ہے۔ بہت سے لوگ بیماری کی تشخیص بھی کر لیتے ہیں۔

نبض پر ہاتھ رکھ کر بیماری کا بتا بھی دیتے ہیں، لیکن علاج ہر ایک کے پاس نہیں ہوتا۔ علاج کا دعوے دار کئی مرتبہ دھوکے کا سامان بیچ رہا ہوتا ہے اور مریض انسان کو موت کے شکنجے میں پھنسا دیتا ہے، دنیا کے ساتھ اس کی آخرت بھی غارت کرنے کے علاوہ اس کا کوئی مقصد نہیں ہوتا۔

ایسے موقع پر ہمیں اپنے عشق محمدی کو جلا بخشنی ہوگی۔ جہاں ہم انھیں مانتے ہیں، وہاں ان کی بھی ماننی ہوگی۔ جیسے ہم ان کے نام پر مرتے ہیں، ان کے کام پر بھی مرنا ہوگا۔ اگر اُن کے نام پر مرنا جانتے ہیں تو اُن کے نام پر جینا بھی سیکھنا ہوگا۔ ان کی زندگی کا مطالعہ کرنا ہوگا۔

کسی وہم نے صدا دی: کوئی آپ کا مماثل؟
تو یقیں پکار اُٹھا: کبھی تھا ، نہ ہے ، نہ ہوگا

آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نسبت بہت اونچی نسبت ہے۔ آپ کی ذات بہت بڑی ذات ہے۔ آپ ایک استاد بھی، پیر بھی، سربراہ بھی، شوہر بھی، داماد بھی، امیر لشکر بھی، حکیم بھی، مدبر بھی، یہ کچھ اور اِس کے علاوہ بھی بہت کچھ ایک ذات میں اللہ پاک نے آپ میں سمو دیا تھا۔ نہ جمال میں آپ کے کمی، نہ کمال میں اور نہ نوال میں۔ آپ امیروں کے لیے بھی مثال، غریبوں کے لیے بھی بے نظیر۔ خوش حالی میں ہیں جو مثل تو پریشانی میں بھی مثیل۔

ان تمام ادوار سے اللہ پاک نے آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو گزارا۔ کہاں سے سلسلہ شروع کیا اور کہاں تک پہنچایا۔ روحانی اور ظاہری عروج کی کس بلند ترین چوٹی پر لا کھڑا کیا۔ دنیا و آخرت کی دولت قدموں میں ڈال دی۔ کیسے کیسے چاہنے والے اصحاب دیے اور اُن چاہنے والوں کو آپ کے طفیل کیا کچھ نہیں ملا۔

ابوبکر پھر وہ ابوبکر نہ رہے۔ عمر پھر وہ عمر نہ رہے۔ علی و معاویہ کس بلندی تک پہنچے۔ حسنین نے کیا مقام حاصل کیا۔ حبشی غلام بلال کے وارے نیارے ہوئے۔ حسان بن ثابت شاعر دربار نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بنے۔ (رضی اللہ عنہم)

میرے دامن طلب کو ہے انھی کے در سے نسبت
کسی اور سے یہ رشتہ کبھی تھا ، نہ ہے ، نہ ہوگا

اگر ہم خود کو کسی بڑے سے جوڑ کر اپنے لیے سامانِ فخر تلاش کرتے ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بڑا اور کامل اور مکمل کوئی نہیں ہوسکتا۔ اس لفظ "مکمل" کو آپ کی ذات میں دو طرح پڑھنا درست ہے: میم پر زبر لگا کر پڑھا جائے تو اِس کا معنی ہے: انتہائی کامل اور اگر میم پر زیر دے کر پڑھا جائے تو اِس کے مطلب ہوگا: کامل بنانے والی ذات۔

کیا ہی بات ہوگی اگر ہماری نسبت اس ذات سے جڑ جائے جو ہمیں کامل بنا کر ہی چھوڑے۔ ہمارے تمام دکھوں کا مداوا ہو، ہماری ہر تمنا کے حصول کا باعث بنے۔ جن کے نقش قدم پر چلنے سے دنیا بھی قدموں میں آجائے اور جنت بھی ہماری منتظر رہے۔ اللہ پاک بھی چاہیں کہ میں اس عاشق کو اپنا دیدار کراؤں، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی حوضِ کوثر پر ہمیں اپنا دیدار کرانے کے منتظر ہوں۔ ہمیں دیکھتے ہی اپنے سینے سے لگالیں اور کہیں کہ لو آیا میرا دیوانہ!

سرِ حشر اُن کی رحمت کا صبیح میں ہوں طالب
مجھے کچھ عمل کا دعویٰ کبھی تھا ، نہ ہے ، نہ ہوگا

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ان کمالات پر غور کرنے کے ساتھ ساتھ ہمیں اس کمال محبت پر بھی غور کرنا ہوگا جو آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنی امت سے تھی اور جو شفقت اور رحم دلی کا گوشہ ہمیں آپ کی ذات اقدس سے ملا اگر ہم زندہ دلی سے اس پر تھوڑا ہی غور کرلیں، آنکھیں کیوں نہ بہہ پڑیں گی، دل آخر کیوں کر تھم نہ جائے گا، آنسو بھی کیسے رکیں گے!

چاہے وہ طائف کے پتھر ہوں یا رشتے داروں کی کڑوی کسیلی، چاہے وہ احد کے زخم ہوں یا نامراد یہود کا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جادو، بدر کے آنسو گننے بیٹھوں یا تہجد کی دعاؤں میں امت کے حصے کا تصور کروں، معراج کو یاد کروں یا شعب ابی طالب کے تین سالہ محاصرے کو سوچوں، زندگی کے

احوال پر غور کروں یا امت سے فراق کی حالت پر غور کروں۔ کوئی لمحہ بھی یا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کوئی دعا بھی امت کے تذکرے سے خالی نظر نہیں آتی۔ لوگ سچی محبت جھوٹی محبت کی باتیں کرتے ہیں، میرا اُن لوگوں سے سوال ہے کہ اس سے زیادہ سچی محبت کی مثال اور کیا ہوسکتی ہے جو آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہم سے تھی۔ ہدہد الہ آبادی کے اشعار ہیں:

میرے آقا نے غم دین میں کیا کیا دیکھا
کبھی طائف کی مشقت، کبھی فاقہ دیکھا
آہ! ہجرت کی گھڑی دل پر کیا گزری ہوگی
بڑی پُر اشک آنکھوں سے جو کعبہ دیکھا

اگر ایسی زندگی ہم نے گزار لی جیسی ہمارے آقا ہماری زندگی دیکھنا چاہتے ہیں تو قیامت کے دن ہمارا سر فخر سے بلند ہوگا۔ دنیا میں بھی بہت کچھ چھوڑ جائیں گے۔ صرف ظاہری اولاد نہیں ہوگی، روحانی بھی ہوگی۔ پیسے اور عہدے کی بنیاد پر ہی چاہنے والے نہ ہوں گے، دل سے محبت کرنے والے بھی ہوں گے۔ تنہائی کی دعاؤں میں بھی یاد رکھنے والے ہوں گے اور آخرت میں اعلیٰ ترین مناصب ہماری آرزو کریں گے۔

جب اس دنیا سے جائیں گے تو یہ جہاں ہمارے فراق میں روئے گا اور جب جنت میں داخل ہوں گے، جنت کی پیاس ہمارے دیدار سے بجھے گی۔

تو آیئے، مل کر یہ عہد کرتے ہیں کہ ہم رجال باصفا بنیں گے۔ مردِ مومن کی داستان رقم کریں گے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی پڑھیں گے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنتوں کو اپنائیں گے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک ایک ادا پر اپنی جان فدا کریں گے۔ ہر ہر عمل میں سنت طریقہ تلاش کریں گے اور اُس کے مطابق زندگی بسر کریں گے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنا آئیڈیل بنائیں گے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنی زندگی کے ہر موقع پر اپنے روبرو تصور کریں گے اور ہر قدم یہ سوچ کر اُٹھائیں گے کہ ہم اس پاک

ہستی کی امت ہیں۔انھوں نے بہت سی قربانیاں ہماری خاطر نے دی ہیں۔

لوح بھی تُو ، قلم بھی تُو ، تیرا وجود الکتاب
گنبدِ آبگینہ رنگ تیرے محیط میں حباب
عالَمِ آب و خاک میں تیرے حضور کا فروغ
ذرہ ریگ کو دیا تُو نے طلوعِ آفتاب
شوکت سنجر و سلیم تیرے جلال کی نمود
فقر جنید و بایزید تیرا جمال بے نقاب
شوق تیرا اگر نہ ہو میری نماز کا امام
میرا قیام بھی حجاب ، میرا سجود بھی حجاب

مستقبل کی تصویر:(Vision)

صبح ہوتی ہے ، شام ہوتی ہے
عمر یوں ہی تمام ہوتی ہے

منشی امیر اللہ تسلیم کا درج بالا شعر ہمارے معاشرے اور اطراف کے اکثر لوگوں کی بخوبی عکاسی کرتا ہے۔ جب بھی میں اس شعر کے مصداق لوگوں کو دیکھتا ہوں تو اُن سے کوسوں دور چلے جانے میں ہی اپنے لیے عافیت محسوس کرتا ہوں۔

ڈر لگتا ہے کہ ان کی روِش پر نہ چل پڑوں۔ ان کی راہ نہ اختیار کر بیٹھوں۔ مجھے معلوم ہے کہ ان کی راہ کوئی راہ ہی نہیں، ان کے پاس کوئی راہ موجود ہی نہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو مقصدِ زندگی سے بالکل عاری ہیں۔

ان کے لیے آج، کل اور پرسوں، سب برابر ہے۔ ان کا کوئی مقصدِ زندگی نہیں۔ ان کے کوئی اہداف نہیں۔ ان میں کوئی جستجو نہیں، کوئی جذبہ نہیں، کوئی طلب نہیں۔ قدرت بھی آخر اُنھیں کچھ کیوں دے، جب یہ لوگ خود کچھ پانا نہیں چاہتے۔

یہ طریقہ انسانی فطرت سے ہم آہنگ ہے نہ اسلامی تعلیمات سے میل کھاتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو ایک مقصدِ زندگی دیا کہ انھیں جنت کے اعلیٰ مراتب حاصل کرنے ہیں۔ انھیں ایک ہدف دیا۔ انھیں بتایا کہ ساری دنیا میں اسلام پھیلانا ہے۔ یہ بتا دیا کہ قیصر و کسریٰ تمھارا ہوگا، یمن تمھارا ہوگا۔ پہلا بحری لشکر تم نکالو گے۔ قسطنطنیہ تم فتح کرو گے۔ بیت المقدس تمھارے ہاتھ میں ہوگا۔ اب یہ کام کر کے دکھانا تمھاری ذمے داری ہے۔ جواں مردی تمھیں ظاہر کرنی ہے۔

رسمی طور پر اِسکولوں میں چھوٹے بچوں سے بھی یہ مضمون لکھوایا جاتا ہے: My Aim in Life، لیکن اس میں وہ جامعیت نہیں ہوتی جو ہونی چاہیے۔ ساتھ ہی آگے چل کر لوگوں کی اس کے بارے میں راہ نمائی نہیں کی جاتی، حالاں کہ تعلیم تو وہ شے ہے جو اِنسان کو نظریہ فراہم کرتی ہے، لیکن اب ایسا ہوتا کم نظر آتا ہے اور اگر راہ نمائی کی جاتی ہے تو لوگ اس میں دل چسپی نہیں لیتے۔

انسان کی زندگی اس کی خود کی ہے۔ اس نے جہاں جانا ہے خود جائے گا۔ اپنے پیروں کے بل پر جائے گا۔ ٹیم، عملہ، خاندان، سب اپنی جگہ اہم ہیں، لیکن اپنی زندگی اپنی ہی ہے۔ اعمال نامہ اپنا ہے۔ سانسیں اپنی ہیں۔ انھیں جیسے چاہے گزارے، کرلے جو کرنا ہے، آخر موت ہے۔ کچھ اچھا کرے گا تو کام یابی قدم چومے گی، ورنہ زندگی بھر منہ کی کھائے گا۔ نہ گھر والوں کو منہ دکھانے کے قابل ہوگا، نہ بیوی بچوں اور اولاد کے سامنے سینہ فخر سے بلند کر سکے گا۔

لہٰذا اپنا vision طے کریں۔ ہر پَل، ہر ساعت، ہر گھڑی، ہر موقع کا ایک vision مقرر کریں۔ زندگی کے ہر کام کو آپس میں چند بڑے مقاصد سے ربط دیں۔

ان بڑے مقاصد کو سب سے بڑے مقصد سے منسلک کر دیں اور وہ مقصد ہونا چاہیے: اللہ تعالیٰ کی رضا۔ اگر اِس انداز سے زندگی جی لی تو زندگی کام یاب ہے، ورنہ کچھ نہیں۔ بہت سے آئے اور چلے گئے۔ آج ان کے نشانات بھی ڈھونڈنے سے نہیں ملتے۔

جس قوم نے بحرِ ظلمات میں گھوڑے دوڑا دیے ہوں، جس نے ایک چھوٹے سے شہر سے نکل کر تین براعظموں تک اپنی حکومت کو پھیلا دیا ہو، احکامِ خداوندی کو سارے عالم تک پہنچا دیا ہو، جس قوم کے ۳۱۳ لوگ ۱۰۰۰ پر غالب آ چکے ہوں، ہزاروں لاکھوں کو شکستِ فاش دے چکے ہوں، اس قوم کا نوجوان ایک با مقصد زندگی گزارنے سے آخر کیوں گھبراتا ہے۔ اگر سکھ اقلیت، رنجیت سنگھ کے دور میں پنجاب سے لے کر کابل تک اپنی حکومت قائم کر کے تاریخ کا حیرت انگیز کارنامہ سرانجام دے سکتی ہے تو اِس قوم کو کس بات کی فکر ہے جس سے نصرتِ خداوندی کا وعدہ ہو چکا ہے۔

وہ آخر کیوں جیل کے قیدیوں کی طرح بے مقصد رہتا ہے۔ اُن کی زندگی میں بھی اداسی اور مایوسی ہونی تو نہیں چاہیے، مگر وہاں کچھ سمجھ میں بھی آتی ہے، لیکن ایک آزاد پنچھی نے کیوں قیدیوں جیسی زندگی گزارنے کا فیصلہ کر رکھا ہے۔

ایک ٹرینر نے انتہائی خوب صورت انداز سے اس بات کو سمجھایا۔ سائنس دان نیوٹن کا پہلا قانون جو ''پہلا قانون'' کے نام سے ہی مشہور ہے کہ ہر چیز اپنی حالت میں رہتی ہے، جب تک اس پر کہیں سے تبدیلی کا کوئی عنصر نہ آئے جو اُسے روکنے یا حرکت کرنے پر آمادہ کر دے۔ اصل میں تو یہ قانون حرکت سے تعلق رکھتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اس کا تعلق انسانی عادات سے بھی ہے، مزاج سے بھی ہے، اندازِ زندگی سے بھی ہے۔ اسے بدلنے کے لیے دو طرح کی قوتیں استعمال ہو سکتی ہیں۔

ایک خارجی قوت ہے۔ جیسے کسی شخص کو دیکھ لینا، سن لینا، پڑھ لینا، اس کی صحبت میں رہ لینا، اس سے متاثر ہو جانا، مرعوب ہو جانا وغیرہ۔ ایک داخلی قوت ہے اور وہ ہے: vision کا موجود ہونا۔ زندگی کا ایک مقصد، ایک ہدف، ایک دھن کا ہونا، جسے وہ اپنے اوپر سوار کر لے اور اُسے پانے میں ہر طرح کی کوشش صرف کر لے۔ یہ اگر مثبت انداز اور رویے کے مطابق ہو تو یہ انسان کا vision ہے۔ چاہے کہنے والے اسے جنون یا پاگل پن کہیں یا اور کچھ کہیں۔

انسان دینی و دنیوی لحاظ سے جو بھی مقاصد طے کرے اسے لکھ لے۔ بہت لمبے خواب دیکھنا درست نہیں، لیکن اچھے مقاصد قائم کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ہمیشہ چھوٹے اور قابل حصول اہداف سے آغاز لے۔ اس طرح وہ نا امیدی کا شکار ہونے سے بچ جائے گا، ساتھ ساتھ اسلامی تعلیمات کو بھی ملحوظ رکھتے ہوئے اس میں آگے بڑھتا رہے۔ اس کی متعدد مثالیں ہو سکتی ہیں۔ طالب علم اپنے نمبرات اعلیٰ کرنے، ٹاپ کرنے، چند فنون میں انتہا کی مہارت پیدا کرنے، مختلف کتابوں کے مطالعے کا ہدف طے کر سکتا ہے۔ عالم دین متعدد دِینی موضوعات پر کام کرنے کا سوچ سکتا ہے۔

مبلّغ یہ سوچ سکتا ہے کہ مجھے اس سال اپنے محلے کے پچاس فی صد نوجوانوں کو نماز کا عادی بنانا ہے، اتنے ممالک میں جا کر اور اِتنے لوگوں کو دین کی دعوت دینی ہے، بازار سے جھوٹ ختم کرنا ہے۔ایک تاجر یہ بھی سوچ سکتا ہے کہ مجھے اپنا معیار بہت اعلیٰ رکھنا ہے۔شرعی بنیادوں پر کام کرنا ہے اور ساری دنیا میں اپنی مصنوعات پہنچانی ہیں۔اپنی فیلڈ کا سب سے بڑا اور دِیانت دار تاجر بننا ہے۔دین اور دُکھی انسانیت کی خدمت کی خاطر حلال مال کمانا ہے اور صَرف کرنا ہے۔عابد، ذکر و عبادت اور معرفت الٰہی میں نئے سنگ میل طے کر سکتا ہے۔ایک واحد آدمی بھی ان تمام چیزوں کو اپنے اہداف میں شامل کر سکتا ہے، انھیں چند بڑے مقاصد اور چند حدود کے تابع بنا کر، پھر اِن بڑے مقاصد کو ایک سب سے بڑے (ultimate) مقصد کے زیر لا کر اِن پر عمل پیرا ہو سکتا ہے۔یہ ہرگز مشکل نہیں ہے۔جذبہ، ہمت اور جوش چاہیے۔

یہ جذبہ پیدا کرنے، vision حاصل کرنے اور اُس کے تحفظ پر بھی مسلسل کام جاری رکھنا ضروری ہے، ورنہ ہمتیں پست ہو جاتی ہیں، حوصلے ختم ہو جاتے ہیں۔

لہٰذا vision کو مضبوط کرنے اور اُس کے مندرجات درست کرتے رہنے کی ضرورت ہے۔یہ نظریاتی لحاظ سے مضبوط اور مضبوط تر ہونے کا تقاضا ہے۔vision تک پہنچنے کے لیے تمام معاون امور پر بھی عمل کرنا ہوگا۔نظام الاوقات مرتب کرنا ہوگا۔ہم نوا لوگوں کی صحبت اختیار کرنی ہوگی۔مضبوط ٹیم تیار کرنی ہوگی، جنھیں آپ پر اور آپ کو اُن پر اِعتماد ہو۔منفی سوچ رکھنے والوں سے اجتناب اور ناکام لوگوں سے صرف اس بنا پر اِجتناب کہ ان کا اثر خود پر نہ آجائے، بھی ضروری ہے۔اسی طرح اپنی ترقی کا اندازہ بھی لگاتے رہنا چاہیے۔چھوٹے مقاصد کو جس ترتیب سے بتایا گیا ویسے سب سے بڑے مقصد کو سامنے رکھتے ہوئے پرکھنا چاہیے۔ہر کام سے پہلے سوچنا اور کرنے کے بعد اپنا محاسبہ کرنا چاہیے، تاکہ ہمیں علم ہو سکے کہ ہم اپنے vision کے کتنا قریب ہو چکے ہیں۔

اہداف قلیل العرصہ اور طویل العرصہ، دونوں طرح کے ہونے چاہییں۔ ہدف کے حصول کی خوشی کو بھی ساتھ مناتے رہنا چاہیے۔

زندگی سے کچھ بڑی امیدیں وابستہ کرنے والے ہی کچھ کر جاتے ہیں۔ یہ سوچنا ہو گا کہ میں آج سے دس سال بعد کہاں کھڑا ہونا چاہتا ہوں، کس طرح پہچانے جانے کی تمنا رکھتا ہوں۔ لوگوں کی اس وقت مجھ سے کیا آرزوئیں ہوں گی اور میں انھیں کس طرح پورا کر رہا ہوں گا۔ اس طرح ہم اپنا آج اور ہر اگلا دن بہتر بنا سکتے ہیں۔

اور مومن تو ہے ہی وہ جس کا ہر اگلا دن پچھلے دن سے بہتر ہو۔

قلندریت

آج ایک منفرد موضوع پر اِنتہائی منفرد اَنداز سے قلم اٹھانے کا ارادہ کیا ہے۔ برسوں سے ذہن میں گھومتی ہوئی منتشر باتوں کو مربوط کرنے کی سوجھی ہے۔ اب تک میں جس نتیجے تک پہنچا ہوں، جو سمجھا ہوں، اسے قارئین کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔ اگر بات درست ہو تو اللہ کا انعام ہے۔ اور اگر غلط ہے تو میرا قصور ہے، ایک شیطانی وسوسہ ہے، جو قارئین کی عدالت میں پیش کرنے کی کھلی جسارت کر رہا ہوں۔

آج کا موضوع مدارس دینیہ کے طلبہ و علماء ہیں۔ اس قوم پر ایک انتہائی گہری نگاہ ڈالنے کا ارادہ کیا ہے۔ چوں کہ میں بھی اب کچھ عرصے سے اس جماعت کا حصہ بن چکا ہوں۔ مقدر نے مجھے بھی ایک بار پھر مدرسے کا رُخ کروا دیا، لیکن اس مرتبہ ناظرہ نہیں درسِ نظامی پڑھنا طے تھا، سو پڑھ لیا اور آگے بڑھ لیے۔

مخاطَب اور مخاطِب: طالب علم

موضوع: طالب علم، حال اور مستقبل کے آئینے میں

۱۔ آپ کون؟

☆ مدرسے کا طالب علم

۲۔ کیا بنو گے؟

☆ عالمِ دین

۳۔ عالمِ دین کون ہوتا ہے؟

☆ ایک ایسا شخص جسے دین اسلام کی صحیح سمجھ ہو۔

۴۔ کیوں بنو گے؟

☆ اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے

۵۔ تمھارا فائدہ کس کو پہنچے گا؟

☆ مجھے، میرے گھر والوں کو، خاندان والوں کو، امت مسلمہ کو، سارے جہاں کو۔

۶۔ فائدہ کیسے پہنچاتے ہو؟

☆ دینی ماحول میں تعلیم کی برکت سے ہمارے اندر دِین کو عام کرنے کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔ ہمارا ایک نظریہ قائم ہو جاتا ہے۔ ہمیں ایک وژن (Vision) مل جاتا ہے۔ اس کی بنیاد پر ہم جا کر مختلف اندازوں سے متعدد دینی خدمات میں سے کسی کا حصہ بن جاتے ہیں۔

۷۔ دینی خدمت کسے کہتے ہیں؟

☆ راستے سے تکلیف دہ چیز کا ہٹا دینا بھی دین ہے۔ کلمہ پڑھنا بھی دین ہے، لیکن علم دین حاصل کرنے کے بعد ہماری ذمے داری بڑھ جاتی ہے۔ ہم پر لازم ہو جاتا ہے کہ ہم اپنے علم کے شایانِ شان اپنا کردار اپنائیں، اپنے روزمرہ کے معمولات اور اپنا پیشہ اسی کے مطابق چنیں۔

تدریس، امامت، اذان۔ یہ سارے دینی شعبے ہیں۔

اسی طرح تبلیغ ایک دینی شعبہ ہے، جس میں ہم لوگوں کو دین کی طرف دعوت دیتے ہیں۔

اصلاح و اِرشاد ایک دینی شعبہ ہے۔ تصنیف و تالیف ایک دینی شعبہ ہے۔ خطابت ایک دینی شعبہ ہے۔

۸۔ بنیادی طور پر دین کی خدمت کے لیے کن چیزوں کی ضرورت ہے؟

☆ بنیادی طور پر دو چیزوں کی ضرورت ہے:

ا: نظریہ۔ یہ ہمیں علم اور اہل علم کی صحبت سے ملتا ہے۔

۲: فراغت۔ جس میں ہم زیادہ سے زیادہ دین کے فروغ کے بارے میں سوچ سکیں۔ مطالعہ کر سکیں۔ دین کی مضبوطی کے بارے میں سوچ سکیں۔

۹۔ ایک عالم دین کن باتوں کا حامل ہوتا؟

☆ دو باتوں کا: علم اور عمل۔ اگر تفصیل سے عرض کروں تو پختہ دینی علم اور اِتنا دنیا کا علم کہ اپنے مخاطبین کی ذہنی صلاحیت کو سمجھ سکے اور اچھے انداز سے ان تک دین کی تعلیمات پہنچا سکے۔ اور عمل میں اس کا کردار، اس کا تحمل، عبادتوں کی طرف اس کا لگاؤ، نمازوں میں اس کی پابندی، ذکرِ الٰہی کا ذوق سب شامل ہے۔

۱۰۔ کیا دین کی خدمت کے مواقع وافر مقدار میں موجود ہیں؟

☆ ہر فیلڈ میں کام کے لوگوں کی کمی بھی ہوتی ہے اور شدید ضرورت بھی۔ دین کی خدمت کے اتنے مواقع ہیں جتنے سمندر میں پانی کے قطرات۔ اصل بات یہ ہے کہ انسان کا ایک نظریہ ہو۔ جب اس کا کوئی نظریہ ہوتا ہے تو وہ خود راستے تراشتا ہے۔ دنیاوی زندگی میں بھی ایک ملازم ہوتا ہے، ایک تاجر۔ تاجر راستہ بناتا ہے، ملازم اس راستے پر چلتا ہے۔ دین کے راستے میں بھی ایک عالمِ دین کا نظریے کا حامل ہونا اور ساتھ ساتھ نظریہ ساز ہونا بھی ضروری ہے، مقصد سامنے ہو کہ اس نے معاشرے میں دین کو عام کرنا ہے، عمل سے ہر گھر کو منور کرنا ہے تو اُسے مواقع ہی مواقع نظر آئیں گے۔

اگر لوگ بڑے عہدے، بڑے نام، بڑی مسجد، بڑا مدرسہ جیسے خیالات ذہن سے نکال دیں یا اپنے آپ کو نااہل سمجھنے کا خیال سرے سے ختم کر دیں تو اُن کے لیے کام ہی کام ہے۔ بس کام کا بننے کی دیر ہے۔

اگر صرف پاکستان کو دیکھیں جو کہ ایک اسلامی ملک ہے، طلبہ وعلما کا یہ طبقہ پوری قوم کا ایک فی صد بھی نہیں۔ اگر باقی ۹۹ فی صد لوگ صرف دین کی بنیادی معلومات بھی رکھتے ہوتے اور

اِتنا علم رکھتے ہوتے کہ اپنی روزمرہ کی زندگی شریعت کے مطابق گزار سکتے تو شاید مزید علما و طلبہ کی ضرورت نہ ہوتی، لیکن اکثر لوگ دین سے ناواقف ہیں لٰہذا اَب ایسے موقع پر علما کی ضرورت گھٹتی ہے یا بڑھتی ہے؟ ہاں، کام کیا کرنا ہے؟ کس طرح کرنا ہے؟ معاشرے میں اپنی جگہ کیسے بنانی ہے؟ یہ ایک چیلنج ہے، اسے سمجھنے کی ضرورت ہے، اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ ہر آدمی اپنا راستہ خود تراشے گا تب کامیاب ہوگا۔

۱۱۔ کام کا موقع فراہم کرکے دینے میں کس پر اِعتماد کیا جائے؟

☆ صرف اللہ پر۔ اور اپنے گھر اور علاقے کو بنیاد بنانے کی کوشش کی جائے۔ ساتھ ساتھ اگر بڑوں کی جانب سے کوئی کام پیش کیا جائے تو اُسے سعادت سمجھا جائے۔

۱۲۔ روزگار کا کیا ہو؟

☆ دین کی خدمت کا راستہ دراصل قلندریت کا راستہ ہے۔ جب آدمی اپنا سب کچھ اللہ کو دے دیتا ہے تب جا کر اُسے کچھ ملتا ہے۔ طالبِ علم اگر اپنی تعلیم پر اِعتماد کر بیٹھے اور یہ خیال کرے کہ مجھے دینی خدمت بھی مل جائے گی اور اِتنا روزگار بھی ہوگا کہ میرا گزر بسر ہو جائے تو وہ ناکام ہوگا۔

طلبہ و علما کے لیے تو اَعمال پر پلنے کا راستہ ہے۔ کسی مخلوق پر، چاہے کتنی قریبی ہی کیوں نہ ہو، اعتماد کرنا اپنے آپ کو دھوکے میں ڈالنے کے مترادف ہے۔ اللہ پاک قرآن کریم میں فرماتے ہیں کہ ہم متقی کو اُس جگہ سے روزی دیتے ہیں جہاں سے اس کا گمان بھی نہیں ہوتا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ جہاں سے انسان کا گمان ہوتا ہے یا کام ہونے کی امید ہوتی ہے وہاں سے کچھ نہیں ہو پاتا اور جہاں سے کوئی امید نہ ہو وہاں سے کام ہوتے نظر آتے ہیں۔ عمل پر پلنے کا مطلب یہ ہے کہ اپنے روزگار میں خالص اللہ کی ذات پر توکل ہو۔ کوئی ذریعۂ آمدن نہ ہو یا ہو تو غیر متوقع یا اگر متوقع بھی ہو تو دل میں اس کی طرف میلان اور جھکاؤ نہ ہو، محض اللہ تعالیٰ کی ذات پر کامل توکل ہو۔

علمِ دین، دین کی خدمت، تقویٰ، نیکی، تہجد کی پابندی، یہ ساری چیزیں روزی کو کھینچ کر اِنسان کے پاس لاتی ہیں۔ اعمال پر پلنے کی صورت میں بھی ذریعہ مخلوق بنتی ہے۔ اللہ پاک کسی کے دل میں ڈال دیتا ہے کہ اس نے فلاں شخص کی ضرورت پوری کرنی ہے۔ وہ آ کر اُس ضرورت کو پورا کر جاتا ہے اور اِسے اپنے لیے اعزاز سمجھتا ہے یا اسے اپنی ذمے داری سمجھتا ہے۔ کسی غریب یا ضرورت مند کی ضرورت پوری کرنے کا تصور اُس کے ذہن میں نہیں ہوتا۔ اعمال پر پلنے کی دو شرائط بھی ہیں، جن کا جاننا ضروری ہے:

① زبان کا سوال نہ ہو۔ ② دل کا سوال نہ ہو،

یعنی نہ زبان سے کسی سے کچھ مانگے اور نہ اس کے دل میں یہ بات ہو کہ فلاں شخص مجھے کچھ دے۔

۱۳۔ دوسرے پر اِعتماد کر کے زندگی گزارنے سے کیا انسان کی خودداری ختم نہیں ہوتی؟

☆ اگر ختم ہو رہی ہے تو یہ شخص اعمال پر پلنے والا ہے ہی نہیں، کسی کے سہارے پر پل رہا ہے۔ اعمال پر پلنے والا درحقیقت صرف اللہ تعالیٰ کے سہارے ہوتا ہے۔ اس کے پاس ایک اصول ہوتا ہے: لا طمع و لا جمع و لا منع۔ کسی سے امید نہیں لگانی، کچھ ملے تو جمع نہیں کرنا اور کوئی کچھ دے تو اُسے منع نہیں کرنا، بل کہ اللہ تعالی کی طرف سے سمجھ کر قبول کر لینا ہے۔

۱۴۔ اعمال پر پلنے سے متعلق جو کچھ آپ نے کہا اور جن شرائط کا تذکرہ کیا، کیا یہ مشکل نہیں ہے؟

☆ مشکل تو ہے، مگر ناممکن نہیں۔ اس کے لیے چند باتیں عرض کر دیتا ہوں: تقویٰ اختیار کریں، دعاؤں کا اہتمام کریں، کوئی وقت ضائع نہ کریں، دین کی خدمت کی دھن اپنے اوپر سوار کر لیں۔ جو لوگ اعمال پر پل رہے ہوں ان کی صحبت اپنائیں، ان کی زندگی کا ابتدا تا انتہا جائزہ لیں اور اُن سے تعلق مضبوط کر لیں۔ اللہ والا بننے کی کوشش کریں۔ جس وقت کسی کے زیرِ کفالت ہوں، مثلاً والدین، بھائی، مدرسہ وغیرہ، اسی وقت سے اللہ پاک سے اس نعمت کے حصول کی دعا مانگتے رہیں۔

ایک اور بات بھی بتا تا چلوں۔ ہر انسان کی روزی طے ہے۔ چند اَعمال سے روزی میں اضافہ ہوتا ہے اور چند بُرائیاں روزی میں کمی کا باعث بنتی ہیں۔ اگر کسی شخص کی روزی اس تک کسی واسطے سے پہنچتی ہے، اللہ پاک اُن اعمال کی وجہ سے اس شخص کے پاس آنے والے مال میں بھی اضافہ کر دیتے ہیں۔ وہ دراصل اس متقی کی روزی میں ہونے والا اضافہ ہی ہوتا ہے۔ اولاد کے نیک ہونے سے والدین، بھائی کے نیک ہونے سے بھائی نفع اٹھا رہا ہوتا ہے۔ ایسے موقع پر کون اُس پر خرچ کرنے میں اپنے لیے اعزاز نہیں سمجھے گا؟

۱۵۔ اگر کوئی اعمال پر چلنے کی شرائط پر پورا نہ اتر پائے، کیا وہ ظاہری اسباب اختیار کر سکتا ہے؟ بعض لوگ کہتے ہیں کہ علما کو ہنر سیکھنے چاہییں، کاروبار میں لگنا چاہیے۔ ان کے کاروبار میں لگنے سے کاروبار میں دین داری آئے گی۔ اس بارے میں کچھ فرمائیں؟

☆ لوگ متعدد طرح کے خیالات رکھتے ہیں۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی مثالیں دیتے ہیں کہ وہ تجارت کرتے تھے۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ ہمیں اپنے مقام و مرتبے کو سمجھنا ہوگا، ہمیں اپنی تعلیمی حیثیت و مرتبے کو پہچاننا ہوگا، ہمیں اپنی صحیح مثال کا پتا لگانا ہوگا۔

اس میں شک نہیں کہ تمام صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم ستاروں کی مانند ہیں، مگر ہماری مثال حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی ہے، حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کی ہے، جنھوں نے گہرائی میں علم حاصل کیا، پھر خودداری کے ساتھ اس علم کو عام کرنے میں مصروف ہو گئے۔ انھوں نے کاروبار اور دیگر دنیاوی مشاغل دیگر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے لیے چھوڑ دیے۔ کچھ سخت حالات بھی دیکھے، پھر مال و دولت کی فراوانی بھی دیکھی۔

ہاں، یہ بات ضروری نہیں ہے کہ انسان پہلے ہی دن سے آئیڈیل مثالوں کے مطابق زندگی بسر کرنے لگے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ آہستہ آہستہ انسان اس مرحلے اور مقام تک پہنچتا ہے۔ اگر کوئی شخص اس مثال پر پورا نہیں اتر پاتا تو اُس کے لیے علامہ اقبال مرحوم کی مثال ہے۔ وہ

وکیل تھے۔صرف اپنے گزر بسر کی خاطر کیس لیتے، جب ان کے پاس ایک ہفتے کے گزارے جتنا پیسا جمع ہوجاتا تھا تو وہ مزید کیس لینے سے انکار کردیتے۔ باقی وقت وہ امت کی فکر میں، اس کے بارے میں لکھتے ہوئے گزارتے۔

ایسے شخص کے لیے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی مثال ہے۔آپ نے مضاربت پر پیسا لگایا ہوا تھا۔آپ نے کاروبار میں اپنا ایک شریک بنایا تھا۔آپ دن میں صرف ایک گھنٹا کاروبار کو دیتے تھے۔ آپ کا باقی وقت دین کی خدمت میں لگتا تھا۔کاروبار سے حاصل ہونے والا مال بھی اکثر دین کی خدمت میں صَرف ہوتا تھا۔

آج بھی دنیا میں ایسے کئی لوگ ہیں۔ وہ صرف وقتی کاروبار یا سرمایہ کاری کرتے ہیں۔کوئی موبائل میں تو کوئی گاڑیوں میں۔کوئی امپورٹ ایکسپورٹ کرلیتا ہے۔کچھ لوگ رئیل اسٹیٹ کے کام میں ہاتھ ڈال لیتے ہیں،کوئی مکان تعمیر کرواتے ہیں،کوئی جگہ کرائے پر لے لیتے ہیں۔ یہ بھی اچھے طریقہ ہائے کاروبار ہیں۔

جس طرح کوئی ڈاکٹر بن کر چھولے نہیں بیچ سکتا،کسی عالمِ دین کے لیے بھی یہ مناسب نہیں کہ وہ دنیا کے پیچھے دن رات لگادے اور اِسی کا ہوکر رہ جائے۔ یہ بات اسے کیسے ہضم ہوسکتی ہے کہ علم کا فروغ،لوگوں کی اصلاح وتربیت کا کام باہر کے لوگ کریں اور وہ محض دنیا کمانے میں لگا رہے۔

یہ بات بھی زیادہ حقیقت کے موافق معلوم نہیں ہوتی ہے کہ وہ تجارت میں لگ کر شرعی تجارت کو فروغ دے رہا ہوتا ہے۔حقیقت تو یہ ہے کہ کئی احکامات سے وہ خود واقف نہیں ہوتا۔ اصل تو یہ ہے کہ وہ کاروبار کے درست احکامات کی ترغیب چلائے، ان کی ترویج کرے۔ اس کے شاگرد اور متعلقین ان احکامات پر چلتے نظر آئیں۔ایک کی بجائے کئی لوگ اس سے فائدہ حاصل کریں گے۔

کاروبار میں لگے ہوئے لوگوں سے اچھا کام تو وہ فورم اور شریعہ کمپلائنس کے ادارے کررہے

ہوتے ہیں جن کے دن رات لوگوں کے کاروباروں کو شریعت کے مطابق کرنے کی فکر میں گزر جاتے ہیں۔ کاروبار میں لگنے والے علما، دیگر علما کی قدردانی بھی کم کرتے ہیں۔ دینی خدمات میں مالی تعاون کی شرح بھی ان کی کم ہوتی ہے۔کئی مرتبہ دوسروں سے حسد بھی کررہے ہوتے ہیں۔ کاروبار میں آکر بڑے اعتماد سے کہہ رہے ہوتے ہیں کہ ہمارا یہاں آنے کا مقصد صرف کاروبار کرنا اور پیسا کمانا ہے۔ان سے زیادہ غیر عالم کاروباری لوگ دین کی خدمت میں جان و مال صرف کررہے ہوتے ہیں۔ میرا تو اُن سے سوال یہ ہے کہ نہ تو بڑے نام وَر کاروباری بن پائے، نہ اللہ کے راستے میں زیادہ دے پائے اور نہ ہی اپنا پورا وقت دین کی خدمت کے لیے دے سکے۔کیا پایا، کیا کھویا؟

کیا یہ بات حیرت انگیز نہیں کہ محترم قاسم علی شاہ صاحب، ان کا ادارہ اور اُن جیسے کئی موٹیویشن اور ٹریننگ کے ادارے لوگوں کی تربیت میں دن رات ایک کررہے ہوں، کمپنی کے افراد کی ٹریننگ کررہے ہوں، اس پر خوب معاوضہ بھی لے رہے ہوں اور ہمارا مولوی بس اپنے کاروبار کی باتیں کرتا رہے۔موٹیویشن پر کام کرنا، قیادت سکھانا، ٹریننگ کرانا، لوگوں کو مثبت راستہ دکھانا، ان کی زندگیوں میں سے منفیت کو ختم کرنا، گھریلو زندگی کے سدھار، زکوٰۃ، صدقہ، عشر کی تعلیم، اسکول کے جال سے نکال کر ہوم اسکولنگ جیسے بہترین تعلیمی نظام کو عام کرنا، والدین کو اَولاد سے اور اَولاد کو والدین سے جوڑنا، یہ باتیں علما سے اچھی کون جان سکتا ہے۔علما کو یہ سکھانا چاہیے۔ ایک عالمِ دین کے گھر والے، اس کی اولاد اور اُس کے رشتے داروں میں اس کے لیے زیادہ محبت اور عقیدت ہونی چاہیے اور یہ سب کچھ پیدا کرنے سے ہوتا ہے۔ بہت کم ہی کوئی چیز خود وجود پاتی ہے۔

اور یہ ادارے اس کام کے اچھے خاصے پیسے بھی حاصل کررہے ہوتے ہیں۔ اگر نوٹ ہی گننا ہوں تو بازار کی دھوپ چھاؤں برداشت کرنے کی بجائے ایسا عزت دار کام کرتے، جس میں

پیسا اور اُستاد کی حیثیت، دونوں برقرار رہتی ہیں۔ اسی طرح دینی خدمات فراہم کرنے کے متعدد پلیٹ فارم آن لائن بھی دست یاب ہو چکے ہیں۔ آدمی بلا معاوضہ چاہے یا معاوضے کے ساتھ دین کی تعلیم کو عام کرسکتا ہے اور ساری دنیا تک پہنچا سکتا ہے۔

عام لوگ بھی کاروبار میں لگے علما سے زیادہ دیگر علما و مفتیان کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ انھیں اپنا بڑا بناتے ہیں، ان کی عزت اور قدردانی کرتے ہیں، انھیں بیان کے لیے بلاتے ہیں۔ مسائل شرعیہ میں ان کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

جو دنیادار اور کاروباری لوگ اپنی اولاد کو عالمِ دین بنانے کا ارادہ کرتے ہیں وہ بھی کسی ایسے عالمِ دین سے متاثر ہوکر یہ فیصلہ نہیں کرتے جو مارکیٹ میں ان کے ساتھ بیٹھ کر اپنا سارا رُعب ختم کر چکا ہو، بل کہ ان کا آئیڈیل بھی وہ علما ہوتے ہیں جو لوگوں میں دین کو عام کرنے کی فکر میں رہتے ہیں۔ میرے خیال میں جو لوگ کہتے ہیں کہ علماء کو کاروبار میں آنا چاہیے، ان کی بات کا بھی مکمل وضاحت کے ساتھ جواب اس کے ضمن میں آ گیا ہے۔ اب ان طالب علموں کا کیا ہو جو اپنی طالبِ علمی بھی خراب کرتے ہیں۔ بغیر کسی ضرورت اور مجبوری، صرف اپنے شوق میں کاروبار کرتے ہیں، اپنے مستقبل کا خوف انھیں اس طرح کھا جاتا ہے کہ اپنا حال ہی خراب کر بیٹھتے ہیں اور اپنی تعلیم کو بھی بُری طرح متاثر کر دیتے ہیں۔ اگر اُنھیں اپنے بجائے امت کا غم لگ جائے تو وہ نہ جانے کہاں سے کہاں نکل جائیں۔

اور اِن تمام باتوں کی اصل یہ ہے کہ آدمی کو فراغت حاصل ہو جائے اور وہ اپنا ذہن، اپنی صلاحیتیں اور اپنے جذبات کو دین کی خدمت میں صرف کر دے۔ اب اگر کوئی شخص کسی دینی منصب پر فائز ہے، مگر اُس پر دنیا پرستی یا بے فکری غالب ہو، اسے دین کی خدمت و اِشاعت کا ذرّہ برابر بھی خیال نہ ہو، زیادہ تر وقت فضول گوئی اور لغو کاموں میں گزرتا ہو، ایسا شخص اُس عالمِ دین سے بہتر کہاں ہوسکتا ہے جو کاروبار بھی کر رہا ہو، مگر دین کی فکر اُسے ہر وقت لگی رہتی

ہواور اپنی طاقت کے بقدر دینی خدمات فراہم کرتا رہتا ہو؟

۱۶۔ جو لوگ بڑے گھرانے کے ہوں، ان کے اخراجات زیادہ ہوں اور کاروبار کو وہ ضروری سمجھتے ہوں، ان کے گھر والوں کی خوشی بھی اسی میں ہو، ایسے لوگ کیا کریں؟ اسی طرح اگر چند بھائیوں کو اپنے والد کا کاروبار مل جائے، ان میں ایک عالمِ دین ہو، اگر وہ بالکل کام نہیں کرے گا یا بہت کم کرے گا تو باقی بھائیوں کو اِس پر اعتراض ہوگا۔ ایسے موقع پر وہ کیا کرے؟

☆ اس کا جواب صرف اتنا ہے کہ دنیا کے مال دار ترین لوگ فارغ ترین نظر آتے ہیں۔ جتنا بڑا CEO ہوتا ہے، اتنا ہی وہ مطالعہ کرتا ہے۔ کئی جگہوں پر جا کر دروس دیتا ہے، لیکچر دیتا ہے۔ ان کے طرز کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اللہ سے مانگنا بھی ہوگا، اپنی ٹیم بھی مضبوط کرنی ہوگی۔ اچھے اور بااعتماد لوگ پیدا یا تلاش کرنے ہوں گے اور اُن کا خیال رکھنا ہوگا۔ اس طرح کے مزید جو بھی ذرائع ہیں، اپنانا ہوں گے۔

رہی بات بھائیوں کے ساتھ ہاتھ بٹانے کی تو اُس کا جواب یہ کہ پہلے تو اپنے جذبات اور کردار سے اپنے بھائیوں کو اپنا ساتھ پر آمادہ کرلے۔ اپنا حصہ کم رکھنا پڑے تو کم رکھے۔ اگر پھر بھی بات نہ بنے تو یہ سمجھ لے کہ بھائی کو اِس بات کی فکر نہیں ہوتی کہ کام ساتھ کرتا ہے یا نہیں، بل کہ یا تو اِس بات کی فکر ہوتی ہے کہ پیسا لے رہا ہے اور کام کچھ نہیں کرتا یا اگر ساتھ رہتے ہوں تو یہ فکر ہوتی ہے کہ گھر میں کتنا دیتا ہے؟ ان دو مسئلوں کو حل کردے، باقی معاملہ بھی ٹھیک ہو جائے گا۔

۱۷۔ دین کی خدمت کا آغاز کہاں سے کیا جائے؟

☆ اپنے گھر سے، اپنے خاندان سے اور اپنے علاقے اور محلے سے۔ اس میں بہت برکت ہے۔ پھر اللہ پاک جہاں تک بھی فیض پھیلاتا جائے وہاں جاتا جائے۔ سب سے مضبوط رشتے انسان کے اپنے گھریلو رشتے ہوتے ہیں۔ انھیں سمجھنا اور نبھانا سیکھنا ہوگا۔ ان میں دین کو عام کرنے کی فکر اور محنت کرنی ہوگی۔ قرآن مجید کی مکی سورتوں میں کئی باتیں ایسی ہیں جو بار بار

دُہرائی جاتی ہیں۔ اس کی وجہ دراصل یہ ہے کہ اسلامی طریقہ کار ہی یہ ہے کہ دکھی دلوں کی حوصلہ افزائی کی جائے، جو لوگ گناہوں کی اور غفلت کی زندگی کے آگے ہار مان چکے ہیں انھیں امیدیں دلائی جائیں، ان کی لیے دعا کی جاتی رہے، پھر باقی معاملہ اللہ پاک کے سپرد کر دینا چاہیے۔

۱۸۔ دینی ادارے کا قیام کس طرح ہوتا ہے؟

☆ دینی ادارے کے قیام کے لیے صرف دو چیزوں کی ضرورت ہے: سوچ اور قربانی۔ اگر آپ کے پاس اپنی ملکیت میں صرف دس روپے ہیں، اس میں سے نو روپے آپ ادارے میں لگا دیں، ادارہ قائم ہو جائے گا۔

۱۹۔ بڑے ادارے اچھے ہوتے ہیں یا چھوٹے ادارے؟

☆ بات یہ ہے کہ ابتدا میں ہر بڑا اِدارہ بھی چھوٹا ادارہ ہی ہوا کرتا ہے۔ چند بڑے اداروں کی نسبت متعدد چھوٹے ادارے بہتر رہتے ہیں۔ بڑے اداروں میں تعلیم سے زیادہ نظام کے استحکام پر توجہ دی جاتی ہے۔ طلبہ سے انفرادی تعلق کم ہی قائم ہو پاتا ہے، سیاست زیادہ ہوتی ہے۔ افراد کی کثرت کے بقدر کام کبھی نہیں ہوتا۔ عملہ، اساتذہ وطلبہ کے ساتھ بسا اوقات زیادتی بھی ہو جاتی ہے۔ نظام کی خاطر بہت سی ایسی پالیسیاں بھی بنانا پڑ جاتی ہیں جن سے ہر شخص تنگ ہوتا ہے۔ دینی اور دنیاوی ہر اِدارے میں یہ بات پائی جاتی ہے۔ یہ بات کوئی غلط نہیں ہے، لیکن بڑے اداروں کی گویا مجبوری ہے۔ اس کے کئی فوائد بھی ہیں۔ زیادہ ماہر اَساتذہ، سہولیات وغیرہ اس میں کبھی زیادہ میسر ہوتی ہیں۔

چھوٹے اداروں میں فائدہ یہ ہوتا ہے کہ ہر کوئی ایک دوسرے کو جانتا ہے۔ نادانستہ طور پر زیادتی کا امکان اس میں کم ہوتا ہے۔ سربراہوں کو ہر بات کا پتا ہوتا ہے۔ تمام عملے سے وابستہ رہتے ہیں۔ طالبِ علموں کو خصوصی توجہ دی جا سکتی ہے۔ اسی بنا پر عاجز کی رائے یہ ہے کہ بڑے

ادارے اپنی جگہ، کثرت کے ساتھ چھوٹے، لیکن معیاری اداروں کے قیام کی بھی شدید ضرورت ہے، جن میں حفظ، ناظرہ، اسکول، پرائمری، درسِ نظامی، دروس القرآن والحدیث، دارالافتاء، شعبۂ دعوت، شعبۂ تحقیق، سب کچھ موجود ہو اور اِس کے علاوہ بھی عوام کو دین سے قریب کرنے کے لیے جن جن ذرائع کو اِختیار کرنا ممکن ہو، کرتے رہنا چاہیے۔

۲۰۔ علمائے کرام کا اسکول اور کالج میں پڑھانا کیسا ہے؟

☆ اپنے ذوق اور اِردگرد کے احوال کو دیکھ کر اِس بات کا فیصلہ کرلیا جائے۔ جانے والا شخص پیسے کمانے کی غرض سے ہرگز نہ جائے۔ صحیح دین کی ترویج اور دُرست عقائد کے فروغ کے لیے وہاں کا رُخ کرے۔ متاثر کرنے کے عزم سے جائے۔ تین چیزیں اس کے اندر پائی جانا چاہییں: درد، انداز، رعب۔ اسکول اور کالج کا طالب علم مدرسے کے طلبہ سے کچھ آزاد ہوگا، لیکن وہ بھی قدردان اور باادب بن جاتا ہے، جب اس کی صحیح راہ نمائی کی جائے، بل کہ محنت سے باحیا، بااخلاق، نمازی اور تہجد گزار بھی بن سکتا ہے اور آگے چل کر ایک اچھا مسلمان اور معاشرے کا اچھا فرد بھی بنتا ہے۔

اس میدان سے متعلق کچھ تجربات بھی عرض کرتا چلوں۔ عاجز نے علما کو بھی اس میدان میں اچھا کردار اَدا کرتے ہوئے دیکھا ہے، لیکن ان سے بھی اچھا کردار تبلیغ اور خانقاہ سے وابستہ لوگوں کا رہا ہے۔ وہ لوگ متاثر کرنا اور لوگوں کو اپنی طرف مائل کرنا زیادہ اچھی طرح جانتے ہیں۔ جواز کی صورت سے بھی اپنے آپ کو بچاتے ہیں۔ دنیاوی تعلیم ان کی زیادہ ہوتی ہے۔ اس کا ایک الگ رعب پڑتا ہے۔ وہ کنویں کے مینڈک سے بڑھ کر بہت کچھ ہوتے ہیں۔ بغیر تکلف کے ان لوگوں سے بات کرنا جانتے ہیں۔ تاویلیں نہیں کرتے، بل کہ اپنی بات پر زیادہ مضبوط ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس بعض ایسے علما بھی دیکھے ہیں جو برجستہ کہہ دیتے ہیں کہ یہ میرا روزگار ہے۔ میں یہاں کمائی کے مقصد سے آتا ہوں۔ دینی خدمت کے لیے میرے پاس اور جگہیں ہیں۔ اللہ ہی ہمارا حافظ وامین ہو! اور واقعی جب ایک جگہ سے انسان کے پاس پیسے آنے لگیں

اور وہاں سے اس کا گزر بسر ہوتا ہو وہ وہاں بہت احتیاط سے کام لینے لگتا ہے۔

ایک اور بات ہمیشہ یاد رہے کہ دنیا ظالم ہے اور دین مظلوم ہے۔ دنیا لوگوں پر غالب آجاتی ہے۔ اسکول کالج کا طالب علم زیادہ سے زیادہ ایک اچھا انسان بن جائے گا۔ میں اس بات کو معمولی نہیں سمجھتا، لیکن ایسا بہت ہی کم ہوگا کہ وہ دین کی خدمت کرے یا دین کو عام کرے، جب کہ مدرسے میں پڑھنے والے آپ کے طلبہ کی اکثریت دین داروں کی ہوگی، ان میں سے ایک بڑی تعداد دین کی خدمت میں لگ جائے گی۔ ایک عالم دین کا فیض جتنا مدرسے کے ذریعے سے پھیل سکتا ہے عام طور پر اِسکول کالجوں سے نہیں پھیل پاتا۔ مدرسوں میں خالص دین سکھایا جاتا ہے، ایک نظریہ دیا جاتا ہے، جب کہ اسکول اور کالج میں دنیا کمانے کی تعلیم پر دھیان ہوتا ہے۔ دین اور تربیت کی حیثیت ثانوی ہوتی ہے۔

تذکرۃ الخلیل سے ایک واقعہ عرض کردوں۔ ایک مرتبہ حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا رحمۃ اللہ علیہ کے پاس ایک کالج میں تدریس کی آفر آئی۔ بہت شان دار تنخواہ تھی، سہولیات بھی خوب تھیں۔ اس وقت ان کے معاشی حالات بھی ٹھیک نہ تھے، وہ مقروض تھے۔ انھوں نے یہ پیش کش اپنے استاد و شیخ حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے رکھی۔ انھوں نے اسے قبول کرنے نہ دیا۔ حضرت نے اپنے شیخ کی بات مان لی، لیکن دل ہی دل میں اس وقت کہنے لگے کہ خود بھی قرضوں میں ڈوبا ہوا ہے، مجھے بھی قرضوں میں مارنا چاہتا ہے۔ اس وقت ان کے مدرسے کے کسی اور ساتھی نے وہ پیش کش قبول کرلی۔

چند برس گزرے۔ مولانا زکریا رحمۃ اللہ علیہ بخاری شریف پڑھانے لگے تھے۔ ایک دن مولانا خلیل احمد سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ ان سے مخاطب ہوکر کہنے لگے: ”تمھیں یاد ہے جب تمھیں کالج کی پیش کش آئی تھی؟ دیکھو، اب تمھیں سب لوگ شیخ الحدیث کہہ کر پکارتے ہیں اور تمھارے اُس دوست کو کوئی نہیں جانتا جو کالج جاچکا ہے۔“ حضرت شیخ الحدیث رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ میرا یہ

بات سنتا تھا کہ میں پھوٹ پھوٹ کر آنسو بہانے لگا۔

دینی خدمات میں بھی انسان کا کیریئر اہمیت رکھتا ہے اور نیک نامی بہر حال نیک نامی ہے۔ لوگوں میں قبولیت پالینا کئی مرتبہ اللہ تعالیٰ کے یہاں مقبولیت کی نشانی ہوتی ہے، البتہ یہ مہلت، ڈھیل اور آزمائش بھی ہوسکتی ہے۔ ہاں، مرنے کے بعد ملنے والا مرتبہ زیادہ قابل اعتبار ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک قبولیت کے لیے ایک بڑی دلیل بھی ہوتا ہے۔

ان ساری باتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے ادارہ علم و عمل نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ عصری اداروں میں علمائے کرام کو بیانات، مختلف پروگرامات، تربیتی نشستیں اور ٹریننگ کرانے کے لیے بھیجا جائے۔ اس میں زیادہ بھلائی اور عافیت نظر آتی ہے۔

۲۱۔ مدرسے میں تعلیم حاصل کرنے والے کون لوگ ہوتے ہیں؟ ان کے کیا جذبات ہوتے ہیں؟ ان کے گھر والوں کے کیا عزائم اور اِرادے ہوتے ہیں؟

☆ اس سوال کا جواب تھوڑا تفصیلی ہے۔ مدرسے میں پڑھنے والے طلبہ بعض اپنے شوق سے پڑھ رہے ہوتے ہیں۔ بعض والدین کے شوق اور اُن کی آرزوؤں کو پورا کرنے میں لگے ہوتے ہیں، اپنا زیادہ ارادہ نہیں ہوتا اور بعض اوقات بالکل بھی نہیں ہوتا۔ اب ان میں بھی سب ایسے نہیں ہوتے جو کسی اور لائن میں جانا چاہ رہے ہوں اور گھر والوں کی وجہ سے اِس جانب آ چکے ہوں، بل کہ کئی طلبہ، چاہے مدرسے کے ہوں یا اسکول کے، انھوں نے یہ فیصلہ ہی نہیں کیا ہوتا کہ انھوں نے جانا کہاں ہے؟ کرنا کیا ہے؟ شاید اِسی لیے تو تعلیم کو نظریہ ساز بتایا جاتا ہے۔ کچھ تعلیم کے بعد ہی آدمی زندگی کا صحیح فیصلہ کرتا ہے۔ اسکول کی طرح مدرسے کے بھی بعض طلبہ پر بچپن کی عادات غالب ہوتی ہیں۔

اب ان کے والدین اور سرپرستوں کے بارے میں کچھ گفتگو ہو جائے۔ بعض ان میں طالب علم کے پڑھنے کے مخالف ہوتے ہیں، بعض موافق۔ بعض اپنی اولاد کو مکمل اختیار دے دیتے

ہیں، زندگی میں جو کرنا چاہو کرو۔ بعض بہت ساتھ دیتے ہیں، بعض زیادہ ساتھ نہیں دیتے۔
بعض غریب ہونے کے باوجود اپنے بچے کو دین کے لیے وقف کر دیتے ہیں اور اُن کا یہی ارادہ ہوتا ہے کہ میرا بچہ دین سیکھے اور آگے دین پھیلائے۔ کبھی بچہ بھی ایسا ہی ہوتا ہے اور کبھی بچہ اُن کی امیدوں کو پورا نہیں کر پاتا۔
بعض والدین مال دار بھی ہوتے ہیں۔ انھوں نے اپنے بچوں کو تعلیم کے لیے فارغ کیا ہوتا ہے اور تعلیم کے بعد اُنھیں کاروبار میں لگانے کا ارادہ ہوتا ہے۔ بعض مال دار والدین نے یہ بھی سوچ رکھا ہوتا ہے کہ میں نے خوب کما لیا ہے۔ میرا بچہ اس سے فائدہ اٹھائے اور دین کی خدمت میں لگ جائے۔ وہ اس کے لیے بھی طرح طرح کی راہیں ہم وار کر رہے ہوتے ہیں۔
بعض والدین خود عالم، حافظ، قاری ہوتے ہیں۔ ان کا جذبہ ہوتا ہے کہ میرا بچہ بھی اسی طرح بنے۔ سب ہی ماشاء اللہ! اپنے اپنے انداز سے لگے رہتے ہیں۔ کسی دور میں صرف عالم اور قاری کے بچے عالم، قاری بنتے تھے۔ دیہات سے لوگ شہر آ کر دین پڑھتے تھے، مگر شہر کے لوگ اس میں دل چسپی نہیں لیتے تھے۔ اب الحمدللہ! فضا بالکل بدل چکی ہے۔ اللہ پاک سبھی کو اِستقامت نصیب فرمائے، آمین۔
ان ساری باتوں کے بیان کرنے کا مقصد کسی کی دل آزاری نہیں، بل کہ حقائق، تجربات اور بزرگانِ دین کے ملفوظات کی روشنی میں کچھ عرض کرنا مقصود ہے۔ اس میں کتب بینی سے زیادہ قطب بینی کا اثر ہے۔ جو اِس میں صحیح بات ہو اُسے اللہ تعالیٰ کے انعامِ خصوصی پر محمول کیا جائے اور جو کچھ غلط ہو اُسے اس سیاہ کار ہی کی طرف منسوب کریں۔ ساتھ غلطی کی اطلاع بھی کر دیں۔
جزاکم اللہ خیرا

استاد محترم رحمۃ اللہ علیہ

استاد محترم حضرت مفتی عاصم ذکی صاحب رحمۃ اللہ علیہ یقیناً اپنی ذات میں انجمن تھے، ایک اَن مول ستارہ تھے، سمندر کی گھٹاؤں میں بھٹکی ہوئی کشتیوں کے لیے روشنی کا منارہ تھے، بے کسوں کا سہارا تھے، تقویٰ اور پرہیز گاری کی انتہا پر فائز تھے، تواضع اور عاجزی واِنکساری ان کا طبعی وصف تھا۔

بلاشبہ بہت سے اداروں، نظریات اور کام یاب لوگوں کے لیے بنیاد کا پتھر تھے، ان کی اساس تھے۔ بڑے بڑے کارناموں اور منصوبوں کے علَم بردار تھے۔ لاتعداد رفاہی اور فلاحی منصوبوں کے روحِ رواں تھے اور یہ سب ہونے کے باوجود منصۂ شہود سے کوسوں دور، مجمع سے بہت بچنے والے اور نام ونمود سے اپنے آپ کو میلوں کے فاصلے پر رکھنے والی ہستی تھے، شہرت سے بہت وحشت محسوس کرتے تھے۔

انتہائی بے ضرر اور مخلص انسان تھے، جن کی نظیر زمانہ شاید ہی کبھی لا سکے گا۔ آپ کی جدائی کا غم میرے لیے ایک بیٹے کی اپنے والد سے جدائی سے زیادہ تو ہوسکتا ہے، لیکن کم نہیں ہے۔

دل کی صفائی، امت کا غم، سادگی اور شرافت آپ کی نمایاں صفات تھیں۔ آپ انتہائی جہاں دیدہ شخص تھے، کئی ممالک کا سفر کر چکے تھے، پاکستان بھر کے کئی علاقوں میں گھوم چکے تھے۔ علوم دینیہ میں کامل دسترس رکھتے تھے، عربی، اردو، انگریزی کے علاوہ بہت سی زبانوں میں عبور رکھتے تھے۔

استاد محترم کانپور کے نواب خاندان سے تھے، خاندانی شرافت بھی تھی اور بزرگانِ دین کی نسبتوں کے امین بھی تھے۔ آپ کا خاندان علمائے کرام اور علمِ دین کا ابتدا سے خادم رہا ہے۔ کانپور میں آپ کے گھرانے کا ایک دینی ادارہ تھا جس میں حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

تک دینی خدمات سرانجام دے چکے ہیں۔آپ کے والد ماجد حضرت ڈاکٹر عبدالحی عارفی رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ مجاز تھے اور آپ خود حضرت مولانا ادریس انصاری رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفۂ مجاز تھے اور سلسلۂ نقشبندیہ مجددیہ غفوریہ کے شیخ تھے۔شہرۂ آفاق کتاب بہشتی زیور کی پہلی مرتبہ اشاعت کی ضرورت تھی،اس موقع پر آپ کی دادی یا نانی نے اپنا سونا بیچ کر اِس کے لیے مطلوبہ رقم فراہم کی تھی۔

استاد جی سے تعارف:

استادمحترم سے میرا تعارف اپنی دینی تعلیم کے ابتدائی دور میں دبئی میں رہائش پذیر اپنے بہنوئی عمران کے ذریعے سے دبئی ہی میں ہوا۔متعدد رشتے داروں سے ملاقات کے بعد یہ اندازہ ہوا کہ یہ واقعی کوئی بہت بڑی ہستی ہیں،جنھوں نے اندرونِ ملک سے زیادہ بیرونِ ملک میرے خاندان کے اتنے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنادیا ہے اور اُن کی درست دینی راہ نمائی کررہے ہیں اور یہ لوگ ان کی برکت سے دین سے اور جامعۃ العلوم الاسلامیہ سے جڑے ہوئے ہیں۔اس وقت میں بنوری ٹاؤن میں نہیں پڑھتا تھا،پٹیل پارہ میں واقع مدرسہ عربیہ شہزادہ مسجد میں زیرِ تعلیم تھا۔ اسی وقت میرے دل میں ان کے لیے محبت اور عقیدت جاگزین ہوئی اور اُن کی ایک تصویر اپنے تصور میں قائم کرلی۔اس وقت میرا خیال تھا کہ وہ بہت زیادہ رعب دار شخص ہوں گے جن سے ملنا اور وقت لینا بھی بظاہر مشکل ہوگا،لیکن وقت نے بہت سے پردے ہٹادیے اور مجھے ایک دل نشین حقیقت سے قریب تر کردیا۔

استادمحترم سے میری پہلی ملاقات میری خالہ زاد بہن کے نکاح کی تقریب میں ہوئی،ان کا نکاح بھی استادمحترم ہی نے پڑھایا تھا،پھر میرے ایک رشتے دار نے ان سے میرا تعارف کروایا اور میرے حضرت جی مولانا شمس الرحمٰن العباسی دامت برکاتہم العالیہ سے تعلق کو بیان کیا۔اس پر وہ بہت خوش ہوئے اور بہت میٹھے انداز سے گفتگو فرمائی۔یہ بھی بتایا کہ ان کے شیخ حضرت مولانا

ادریس انصاری رحمۃ اللہ علیہ کا سلسلہ بھی ہمارے دادا شیخ حضرت جی مولانا عبدالغفور عباسی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے ملتا ہے، لیکن اس موقع پر بھی یا اور کسی موقع پر بھی استاد جی نے یہ نہیں بتایا اور نہ کبھی ظاہر ہونے دیا کہ انھیں مولانا ادریس انصاری رحمۃ اللہ علیہ سے خلافت بھی حاصل تھی۔ اس کے بعد ہر سال استاد جی کے پیچھے دس روزہ تراویح پڑھنے اور ختم والے دن آپ کی دل سوز مناجات ''الٰھی! لاتعذبنی، فانی مقر بالذی قد کان منی'' سننے کی سعادت حاصل کرتا رہا۔

درجۂ سابعہ میں استاد جی سے با قاعدہ سبق پڑھنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ اسی سال استاد جی کے مقام ومرتبے کا مزید اندازہ ہوا۔ استاد جی کی خدمت کا موقع بھی ملا اور تب سے علالت سے پہلے تک ملاقات اور رابطوں کا سلسلہ جاری رہا۔ اکثر اُستاد جی سے واٹس ایپ پر بھی رابطہ رہتا تھا۔ استاد جی میرے مضامین بھی پڑھتے تھے اور اُس کے علاوہ بھی کوئی سرگرمی ہوتی تھی تو اُس سے باخبر رہتے تھے اور بہت زیادہ حوصلہ افزائی فرماتے تھے۔

درس گاہ میں پہلا دن:

درجۂ سابعہ میں ہماری کلاس کا پہلا دن تھا، استاد جی خاصی تیز رفتاری سے کمرۂ جماعت میں تشریف لائے اور اپنی نشست پر جلوہ افروز ہو گئے۔ حاضری رجسٹر ہاتھ میں لیا اور تمام طلبہ سے کہا کہ ایک ایک کر کے اپنا تعارف کراؤ۔ جس طالب علم کی باری ہوتی وہ کھڑا ہو جاتا اور اپنے بارے میں بتاتا۔ اس عجیب انداز کا ہماری جماعت کے ساتھیوں نے بہت فائدہ دیکھا، لیکن اس سے بھی حیرت انگیز بات یہ تھی کہ کئی مرتبہ طالب علم کے کھڑے ہوتے ہی استاد جی صرف چہرہ دیکھ کر یہ بتا دیتے تھے کہ فلاں شخص کون سے علاقے کا ہے اور اُس سے اسی کی زبان میں تعارفی کلمات ادا کرتے تھے، اس سے استاد جی کی فہم وفراست اور اُن کی جہاں دیدگی کا ہمیں یقین ہو گیا تھا۔ اس سے معلوم ہوتا تھا کہ استاد جی پاکستان کے ایسے ایسے علاقے بھی گھوم چکے ہیں جہاں کسی بڑے

گھرانے کے اور شہری شخص کے جانے کا تصور بھی کم ہوتا ہے اور وہاں کے لوگوں کے ساتھ اچھا خاصا وقت بھی گزارا ہے اور ساتھ ساتھ استاد جی کی ذہانت و فطانت کا بھی ثبوت مل جاتا تھا کہ کیسے لوگوں کے چہرے پڑھ لیتے ہیں۔ یہ عمل دو دِن تک جاری رہا اور اُس کے بعد باقاعدہ اسباق کا آغاز ہوا۔

سجدۂ عشق کو آستاں مل گیا
سرزمیں کو مری آسماں مل گیا

بے مثال استاذ:

عام طور پر جن اساتذۂ کرام کی مصروفیات زیادہ ہوتی ہیں اور تعلیم کے علاوہ دیگر اُمور سے بھی وابستگی رہتی ہے یا انتظامی امور میں دخل ہوتا ہے، ان کی تدریسی کارکردگی کافی متاثر ہو جاتی ہے، جو کہ ایک قابلِ اعتراف حقیقت ہے، لیکن استاد جی اس حیثیت سے بھی منفرد تھے کہ تمام تر مصروفیات، تعلقات اور اَسفار کے باوجود اُستاد جی ایک بہترین مدرس تھے۔ اسفار کے علاوہ استاد جی باقاعدگی سے وقت پر درس گاہ تشریف لاتے تھے، گردوں کی تکلیف ہو یا شدید بخار ہو، ناغہ نہیں کرتے تھے۔ مجھے ان سے علوم القرآن کی دو عمدہ ترین کتابیں ''التبیان فی علوم القرآن'' اور ''یتیمۃ البیان فی شئ من علوم القرآن'' پڑھنے کی سعادت حاصل ہوئی۔

ان کتابوں میں عبارت بہت زیادہ ہے اور ''یتیمۃ البیان'' کی عبارت تو کافی دقیق اور پیچیدہ بھی ہے۔ ان دونوں کتابوں کی عبارت بھی پڑھنا ہوتی ہے، اردو ترجمہ بھی کرنا ہوتا ہے اور اُس کی تشریح کر کے طلبہ کو سمجھانا بھی ہوتا ہے۔ استاد جی بہت تیز رفتاری سے عربی عبارت پڑھتے تھے، میری کمزوری سمجھیں یا استعداد کہیں، میں اعراب کی غلطی بہت جلدی پکڑ لیتا ہوں، کوئی غلط اعراب پڑھ لے تو فوراً جا کر کان میں چبھتا ہے اور میں نہ چاہتے ہوئے بھی کسی کی غلطی سمجھ لیتا ہوں۔

یہ بات بتانے کا مقصد صرف اتنا ہے کہ قارئین کو یقین ہو جائے کہ استاد جی کی عبارت میں بلا مبالغہ ایک زبر، زیر یا پیش کی غلطی بھی نہیں ہوتی تھی، یہاں تک کہ ان دونوں کتابوں میں مذکور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم، تابعین و تبع تابعین اور مفسرین رحمۃ اللہ علیہم کے نام اور اُن کے القابات میں بھی اعراب کی غلطی نہیں ہوتی تھی، بل کہ انھیں سن کر صحیح اعراب معلوم کرنا بھی ممکن تھا اور تراجم کی کتابوں میں دیکھ کر اُن کی مبارک زبان سے ادا کردہ اعراب کی تصدیق بھی کی جاسکتی تھی۔ یہ ان کے وسیع مطالعے اور اُن کی علمی استعداد کا واضح ثبوت تھا۔

استاد جی کا اُردو ترجمہ اتنا با محاورہ اور فصیح و بلیغ ہوتا تھا کہ اگر اُن کا وہ مکمل ترجمہ محفوظ کرلیا جاتا تو اہلِ دنیا کو اِن کتابوں کا ایک نایاب اور معیاری ترجمہ مل جاتا اور وہ بغیر کسی تکلف کے بہت تیز رفتاری سے ترجمہ کر لیتے تھے۔ ہمیں یہ معلوم ہوتا تھا کہ ہم واقعی کسی اردو دان اور صاحبِ مطالعہ شخص سے سبق پڑھ رہے ہیں۔ واقعات سناتے وقت جو منظر نگاری کرتے تھے اور جو کلائمیکس پیدا کرتے تھے، وہ بے مثال تھا۔ وہ فی البدیہہ ایسا کر لیتے تھے اور ہم بہ تکلف اور مشق کے بعد بھی اس درجے تک نہیں پہنچ پا رہے۔

مجھے پڑھانے کا کم موقع ملا ہے، لیکن میں نے پڑھاتے وقت متعدد اَساتذۂ کرام کا طرز نقل کرنے کی کوشش کی ہے اور کسی حد تک کام یاب بھی ہوا ہوں، لیکن استاد جی کا طرز نقل کرنے میں ابھی تک ناکام رہا ہوں، بل کہ استاد جی کی طرح فی البدیہہ لطیفہ بیان کرنا بھی نہیں سیکھ پایا ہوں۔ استاد جی فی البدیہہ پڑھاتے تھے اور فی البدیہہ اشعار، لطیفے اور واقعات سنا دیتے تھے۔ تقابل مقصود نہیں ہے، لیکن جتنی دیر میں کوئی استاد ایک لطیفہ، ایک شعر اور ایک دن کا سبق پڑھاتے تھے اتنی دیر میں استاد محترم کئی لطیفے، کئی اشعار، کئی بزرگوں کے واقعات، کئی محاورے اور ضرب الامثال اور کئی دن کا سبق پڑھا چکے ہوتے تھے اور ساتھ ساتھ کئی اسفار کے واقعے اور سبق آموز باتیں بھی بیان کر چکے ہوتے تھے۔ اور صرف سبق ہی کا نہیں، بل کہ لطیفوں اور اَشعار کا بھی حق ادا کرتے

تھے۔ان کے کسی لطیفے پر بھی ہنسی روکنا ممکن ہی نہیں تھا اور ہر سبق میں نہ جانے کتنے نئے لطیفے سننے کو ملتے تھے، کبھی کوئی پرانا لطیفہ نہیں ہوتا تھا اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ استاد جی کے تمام لطیفے بھی استاد جی کی طرح پاکیزہ ہوتے تھے، ان میں کوئی غلط بات، کوئی بُری بات، نامناسب گفتگو یا الفاظ نہیں ہوتے تھے اور نہ ہی ہم نے کبھی استاد محترم کی زبان سے کوئی نامناسب لفظ سنا ہے۔ استاد جی کے لطائف کو بھی احقر نے جمع کیا ہوا ہے، ان شاء اللہ! کبھی منظرِ عام پر لائے جائیں گے۔

استاد جی طبیعت کے بہت حساس تھے، لیکن ساتھ ہی حلم اور بردباری کا پہاڑ بھی تھے۔ کبھی غصہ نہیں ہوتے تھے اور نہ ہی کبھی ڈانٹتے تھے، بہت دھیمے انداز سے طلبہ کو سمجھاتے، ان کے ضمیروں کو جھنجھوڑتے اور اُن میں احساسِ ذمہ داری پیدا کر دیتے تھے۔

ایک مرتبہ کی بات ہے کہ بعض طلبہ استاد جی کے آنے کے بعد بھی آپس میں باتیں کر رہے تھے، اس پر استاد جی ناراض ہو کر کمرۂ جماعت سے چلے گئے اور کہا کہ اتنی تکالیف اور مصروفیات کے باوجود صرف تم لوگوں کے لیے یہاں آتا ہوں اور تم لوگ میرے ساتھ یہ سلوک کرتے ہو۔ اگر میں نہ آؤں تو مجھے کوئی کچھ نہ کہے، لیکن صرف تم لوگوں کی خاطر آتا ہوں۔ بس یہ کہہ کر چلے گئے اور دو دِن تک تشریف نہ لائے، طلبہ نے جب تک خوب معافیاں نہیں مانگیں ان کی یہ محرومی کی سزا جاری رہی۔ دوبارہ درس گاہ میں آنے کے بعد اُستاد جی نے بہت عجیب بات کہی، فرمانے لگے: میں بھی ڈانٹ سکتا ہوں اور سختی کر سکتا ہوں، لیکن میں اپنا مزاج خراب نہیں کرنا چاہتا، اس لیے نہیں ڈانتا۔

استاد جی واقعی ایک بے مثال استاد تھے۔ ان کے سبق میں تربیت بھی ہوتی تھی، تعلیم بھی اور تفریح بھی اور ایک پل کے لیے بھی بوجھ نہیں ہوتا تھا۔ استاد جی کا سبق اور اُستاد جی کی باتیں بآسانی ذہن نشین ہوجاتی تھیں۔ وہ باتیں ابھی تک یاد ہیں اور یہ ان کی برکت اور سادگی ہی کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔

مربی ومرشد:

استاد جی پہلے عزت ومحبت اور شفقت کے ذریعے لوگوں کا دل جیت لیتے تھے اور پھر اِسی شفقت بھرے انداز میں لوگوں کی اصلاح وتربیت فرماتے تھے۔ مجھے ''بھائی سعد میاں!'' کہہ کر پکارا کرتے تھے اور مجھے ان کا اس طرح پکارنا بہت پسند تھا۔

میرے ایک رشتے دار آصف نے مجھے بتایا کہ مجھے میرا ایک دوست استاد جی سے ملانے بنوری ٹاؤن لے آیا، میں نے اس وقت تک تبلیغی جماعت میں کچھ ہی وقت لگایا تھا، استاد جی سے وہ میری پہلی ملاقات تھی، استاد جی نے بہت شفقت بھرے انداز سے مجھ سے گفتگو فرمائی، میرے چہرے پر ہاتھ پھیرا اور کسی سے کہا کہ مجھے جامعہ کا دورہ کرائیں، اس وقت سے ان کے دل میں جامعہ اور اُستاد جی کی محبت وعقیدت رچ بس گئی اور اُس کے بعد سے انھوں نے ڈاڑھی بھی رکھ لی۔

ایک مرتبہ استاد جی نے مجھے ایک چیک دیا اور بینک سے کیش کرانے کا کہا۔ واپسی پر میں نے استاد جی سے کہا کہ کاؤنٹر پر عورت بیٹھی تھی۔ استاد جی نے کہا کہ تم نے اس سے زیادہ باتیں تو نہیں کیں؟ میں نے کہا کہ استاد جی! نہیں۔ بس اسے شادی کا وظیفہ بتایا اور بینک کی نوکری چھوڑنے کی دعوت دی۔ اس پر اُستاد جی مسکرائے بھی اور کہا کہ اس سے باتیں نہ کرنا، ورنہ آپ کو آئندہ بینک نہیں بھیج سکوں گا۔

اگر کسی طالب علم کو سبق کے اوقات میں کام کے لیے بھیجتے تھے تو اُس کے آنے تک سبق نہیں پڑھاتے تھے۔ ایک مرتبہ مجھے بینک بھیجا، واپسی پر میں نے دیکھا کہ اگلے دورانیے کے استاد مولانا یاسین صاحب دامت برکاتہم العالیہ تشریف لا چکے ہیں، میں کمرۂ جماعت میں چلا گیا اور سبق سے فارغ ہونے کے بعد پھر اُستاد جی سے دفتر میں ملاقات کی، ان کی امانت انھیں دی اور تاخیر کی وجہ بھی بیان کی کہ اگلے دورانیے کے استاد آ چکے تھے، اس پر اُنھوں نے بہت خوشی کا اظہار کیا اور تعریف بھی کی۔

استاد جی فرمانے لگے کہ ایک مرتبہ میں اپنی اہلیہ کے ساتھ کسی مغربی ملک میں تھا، بس یا ٹرین کا سفر تھا۔ اہلیہ کو میں نے عورتوں کے درمیان بیٹھنے کا کہا، میرے سامنے کی جگہ پر ایک عورت بیٹھی تھی اور اُس کے برابر کی جگہ خالی تھی۔ میں نے ایک انگریز کو اُس جگہ بیٹھنے کا کہا اور میں اس کی جگہ بیٹھ گیا۔ اس عورت نے مجھ سے میرا تعارف پوچھا تو میں نے اسے بتایا کہ میں مسلمان ہوں اور پاکستان سے ہوں۔ وہ پردہ نشین خاتون میری اہلیہ ہیں، وہ فلاں ملک کی ہیں اور شادی کے بعد میرے ساتھ پاکستان منتقل ہوگئی ہیں۔ وہ بہت خوش ہوئی اور ایک کپڑے سے اپنا سر اور چہرہ ڈھانپنے لگی اور انگریزی میں میری اہلیہ کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگی کہ یہ عورتیں اچھی ہیں اور بے پردہ عورتوں کو کہا کہ یہ بُری عورتیں ہیں۔

ایک دن دورانِ سبق میں فرمانے لگے کہ میں دنیا کے مختلف ممالک کا سفر کر چکا ہوں اور وہاں کے مدارس کا دورہ کر چکا ہوں، جو رونق پاکستان، ہندوستان اور بنگلہ دیش کے مدارس میں پائی جاتی ہے دنیا کے کسی ملک اور کسی جامعہ میں نہیں ہے، اس لیے اس نعمت کا بھرپور شکر اَدا کرو۔

ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ استادِ محترم بلوچستان کے کسی علاقے میں رفاہی اور دینی خدمات کے سلسلے میں تشریف لے گئے، اُس جگہ پانی کی بہت قلت تھی۔ عام طور پر علمائے کرام اور مخیر حضرات کے لیے کوئی بھی اہلِ محلہ یا صاحبِ مدرسہ بھرپور اِنتظام کرتا ہے اور اُس کی خوب خاطر کی جاتی ہے۔ بلوچستان کے سفر میں استاد جی اور اُن کے ہم راہیوں کے لیے نہانے کے اچھے خاصے پانی کا انتظام کیا گیا، استاد جی نے اتنی مقدار پانی قبول کرنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ یہ وہاں کے لوگوں کے ساتھ ظلم ہے کہ وہ پینے کے لیے پانی کو ترسیں اور ہم اس طرح عیاشیاں کریں۔ سبحان اللہ! اللہ پاک نے استادِ محترم کو کتنی گہری نگاہ اور کتنا صبر و تحمل عطا کیا تھا۔ شہری شخص ہو، گرم علاقہ ہو اور پھر بھی بھرپور پانی سے نہ نہائے، کتنے صبر کی بات ہے! مجھے تو اِس بات پر بھی حیرانی ہے کہ نیند کے مسائل کے باوجود اُستاد جی اتنے اسفار کیسے کرتے ہوں گے۔

استاد جی زمین اور چٹائی پر یا شور میں سونے کے عادی نہیں تھے۔ بستر، نرم تکیہ اور پُرسکون کمرہ استاد جی کے آرام کے لیے بنیاد ضرورت تھی اور اُس کی وجہ واضح ہے کہ استاد جی بڑے گھرانے میں پلے تھے، لیکن ایک طرف یہ ضروریات تھیں تو دوسری طرف امت کا غم تھا جو سب باتوں پر حاوی آ چکا تھا۔ اس میں مجھ جیسے نزاکت پسند اِنسان کے سیکھنے کے لیے بہت باتیں ہیں، بس اللہ پاک توفیق اور ہمت عطا کرے۔

استاد جی فرمانے لگے کہ بعض لوگ بزرگوں اور خانقاہوں سے صرف اس لیے تعلق قائم کرتے ہیں کہ لوگوں سے روابط بڑھیں اور بالخصوص شیخ کے مال دار مریدوں سے تعلقات قائم ہوں۔ میرے سامنے ایسی کئی مثالیں ہیں کہ لوگ خانقاہ آتے ہیں، مرید بنتے ہیں، دیگر مریدوں سے تھوڑا اِختلاط کرتے ہیں اور پھر اپنے مطالبات شروع کر دیتے ہیں کہ میرا فلاں جگہ مدرسہ ہے، وہاں پیسوں کی ضرورت ہے، فلاں جگہ خانقاہ ہے، غریب آبادی ہے، کھانے کے لالے پڑے ہیں، آپ سے تعاون کی درخواست ہے۔ کئی ان میں دھوکے باز ہوتے ہیں۔ ویسے بھی لوگوں کی یہ روش بالکل غلط ہے، اللہ والوں کے پاس صرف اللہ کے حصول کے لیے جانا چاہیے، کسی سے تعلق اور روابط قائم کرنا مقصد بنا کر جائیں گے تو ناکام ہو جائیں گے۔

ایک مرتبہ یوں کہا کہ کبھی کوئی مولوی صاحب ہدیہ دیں تو یہ نہ پوچھا کرو کہ کہاں سے لیا، کیوں کہ اکثر مولوی صاحبان کو چیزیں ہدیے میں ملی ہوتی ہیں، لیکن ہدیے میں انھیں ملتی ہیں جنھیں ملتی ہیں، ہمیں تو اکثر چیزیں خریدنی پڑتی ہیں۔

اسی دن میرے ہم مکتب طالب علم محمد نعیم کو اپنا عینک ہدیہ کیا تھا اور اِسی مناسبت سے یہ بات کہی تھی اور فرمایا کہ میں نے خود آئی ماسٹر سے یہ عینک خریدا ہے، یہ مجھے ہدیے میں نہیں ملا ہے۔ اس سے پچھلے دن محمد نعیم خلافِ معمول بغیر عینک کے درس گاہ میں آیا تھا۔ یہ استاد جی کی شفقت تھی اور ہر ہر طالب علم پر توجہ کا اثر تھا کہ لگ بھگ ایک سو بیس طالب علموں میں انھیں یاد تھا کہ فلاں

طالب علم عینک پہنتا ہے اور اُس دن بلا عینک درس گاہ میں آیا ہے۔ استاد جی نے اس سے وجہ پوچھی تو اُس نے کہا کہ صفائی کرتے وقت ٹوٹ گیا ہے۔ اس موقع پر اُستاد جی نے اسے اپنا عینک ہدیہ کرنے کا وعدہ کرلیا اور اگلے دن وہ وعدہ پورا بھی کیا۔

ایک مرتبہ درس گاہ میں مفتی نظام الدین شامزی شہید رحمۃ اللہ علیہ کے ہم راہ اپنے بنگلا دیش کے سفر کا تذکرہ کیا اور فرمانے لگے کہ ہم نے وہاں نابینا حفاظ کا ایک بہترین مدرسہ دیکھا، وہاں بچے ریلوں کی مدد سے قرآن مجید سمجھتے اور یاد کرتے تھے۔ ایک نابینا بچے نے قرآن مجید بہت عمدہ سنایا، جس پر مفتی نظام الدین شامزی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے انعام کے طور پر پیسے دیے اور پوچھا کہ اس سے کیا خریدو گے؟ اس پر اُس نے کہا: ''بب...... بب...... بروسٹ ٹ کھاؤں گا۔''

استاد جی مفتی جمیل احمد خان صاحب کے ساتھ کہیں بیرونِ ملک سفر ہوا، وہاں کسی نے ان سے بھیک مانگی، اس پر مفتی جمیل خان صاحب نے اسے خوب پیسے دیے اور کہا: ان کافروں نے ہمیں بہت بہت پیسے کھلائے ہیں اور ہمیں مقروض کر دیا ہے۔ (ان کی مراد اِس سے حکومت تھی)، آج یہ مانگ رہے ہیں اور ہم دے رہے ہیں، انھیں خوب دو۔

ایک مرتبہ فرمانے لگے: کوئی بھی عقلِ کل نہیں ہوتا، کسی کو چھوٹا مت سمجھو، ہر ایک کو حیثیت دو اور اُس سے مشورہ کیا کرو، بعض مرتبہ جسے ہم بہت معمولی سمجھ رہے ہوتے ہیں وہ بہت قیمتی ترین مشورے دے دیتا ہے اور کام کو بہت بہتر اور آسان کروا دیتا ہے۔ میری اہلیہ نے زیادہ دینی تعلیم حاصل نہیں کی ہے، لیکن ایک مرتبہ کسی موقع پر اُنھوں نے کسی دینی کام کے سلسلے میں ایسا مشورہ دیا کہ میں حیران رہ گیا کہ یہ بات اب تک میرے ذہن میں نہیں آئی تھی اور اُن کے ذہن میں آ گئی۔

درس گاہ میں دیگر طلبہ سمیت کبھی کبھار میں عبارت پڑھتا تھا اور اُستاد محترم ترجمہ اور تشریح کرتے تھے۔ ایک مرتبہ استاد جی کے تشریح سے فارغ ہونے کے بعد میں نے عبارت کافی پیچھے سے پڑھ لی، اس پر اُستاد محترم فرمانے لگے: دیکھو، مجھے اس عمر میں یاد ہے کہ عبارت کہاں سے پڑھنی

ہے اور روزانہ سبق کے لیے آتا ہوں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ عبارت کہاں سے پڑھنی ہے اور اِسے ابھی عبارت پڑھتے ہوئے بھی یاد نہیں کہ کہاں سے پڑھنا ہے، پتا نہیں کہاں گھومنے چلا گیا ہے اور کون سے باغیچے میں ہے۔

متصلب فی الدین، یعنی دین میں پختگی:

استاد جی انتہائی زیادہ عبادات کے پابند تھے، تکبیر اولیٰ کا اہتمام فرماتے تھے۔ کہیں باہر نہ ہوں تو اپنے مقام کی مسجد عثمانیہ میں ابتدائی صفوں ہی میں نظر آتے تھے۔ اتنی صفات، کمالات اور بے پناہ استعداد کے باوجود اُستاد جی اکثریت کے ساتھ رہتے، ان کا کوئی تفرد اور اِنفرادی رائے نہیں تھی۔ استاد جی نے امت میں جوڑ کی ہمیشہ کوشش کی ہے۔ ایام حج کے دوران میں منیٰ میں قصر و اِتمام کے مسئلے میں بنوری ٹاؤن اور دارالعلوم کراچی کے درمیان پائے جانے والے اختلاف کو حل کرنے کی انھوں نے بہت کوششیں کیں، دارالعلوم جا کر وہاں کے حضرات سے ملاقات کرنا، پھر اِجلاس منعقد کرنا اور پھر عمرے کے لیے متعدد اِداروں کے علما اور مفتیانِ کرام کا ایک وفد روانہ کرنا جو وہاں جا کر منیٰ کے مقام کا جائزہ لے، ان سب امور میں استاد جی کا بہت بڑا کردار تھا۔ جامعہ بنوری ٹاؤن کی تاریخ میں ایک ہی مرتبہ ایسا ہوا ہے کہ اتنا بڑا اجلاس بھی منعقد کیا ہو اور جامعہ کے توسط سے عمرے کے لیے وفد بھی گیا ہو اور اُس کا سارا اِنتظام اور اخراجات بھی جامعہ کے ذریعے سے پورے ہوئے ہوں۔ اس عمل میں دو شہیدوں کا بہت بڑا کردار تھا، ایک مولانا عطاء الرحمن شہید رحمۃ اللہ علیہ کا جو ہوائی جہاز کے حادثے میں اس سال شہید ہوئے جب میں درجۂ اولیٰ میں تھا اور دوسرے استاد محترم مفتی عاصم ذکی رحمۃ اللہ علیہ جو کرونا کی بیماری میں رخصت ہو گئے اور یہ فقیر تخصص سالِ دوم کے اختتامی مراحل سے گزر رہا ہے۔

ان کے اسفار اور تعلقات کی بنا پر میرا یہ خیال تھا کہ استاد جی مسائل میں کافی نرم ہوں گے،

لیکن استاد جی کا اکثر رجحان جامعۃ العلوم الاسلامیہ کے موقف ہی کی طرف نظر آیا۔ میرے بہنوئی عمران نے مجھے یہ واقعہ سنایا کہ ایک مرتبہ استاد جی دبئی تشریف لائے۔ وہاں بہنوئی اور اُستاد جی کے دیگر معتقدین جمع تھے۔ استاد جی ان کے لیے شیخ بھی تھے اور مفتی کا کردار بھی ادا کرتے تھے، جب کوئی مسئلہ آتا تو اُستاد جی سے ہی رجوع کرتے تھے۔ انھوں نے ایک مسئلہ دریافت کیا اور اسی مسئلے کو مختلف پیرایوں میں گھما کر اُستاد جی پوچھتے رہے اور بہنوئی کہتے ہیں: وہ قصداً استاد جی کو آزما رہے تھے کہ شاید کسی بات کو سن کر وہ نرم ہو جائیں اور ہمیں گنجائش دے دیں۔ وہ دیکھنا چاہتے تھے کہ استاد جی گنجائش دیتے ہیں یا نہیں، لیکن استاد جی اپنی بات پر جمے رہے اور کہا بھی کہ اس بات کو تم جس طرح بھی گھماؤ، اس کا جواب یہی ہے۔ جب انھیں کوئی مسئلہ آتا تو دعاؤں کے لیے بھی ان کا ملجا استاد جی کی ذاتِ اقدس ہی تھی، جو کہ یقیناً ایک مستجاب الدعوات ہستی تھی۔

شاگردی کا زمانہ:

استاد جی نے اپنے حفظ کا واقعہ سنایا کہ ان کے کئی پارے حفظ ہونا باقی تھے اور اُن کے گھر والوں نے ہندوستان کسی رشتے دار کی شادی میں جانے کا پروگرام بنالیا تھا اور مکمل تیاری بھی کر لی تھی۔ استاد جی کے حفظ کے استاد نے انھیں جانے سے منع کر دیا اور اُستاد جی کے والد صاحب سے کہا کہ جب تک ان کا قرآن مجید مکمل نہیں ہو گا یہ کسی صورت کہیں نہیں جائیں گے۔ اس پر اُن کا پورا گھرانا پریشان ہو گیا، لیکن وہ اپنے استاد کے حکم کی مخالفت نہیں کر سکتے تھے، چناں چہ انھوں نے زیادہ زیادہ سبق یاد کرنا اور سنانا شروع کیا، اس طرح چند ہی دنوں میں سفر پر جانے سے پہلے ہی اپنا قرآن مجید مکمل کر لیا، اور فرماتے ہیں کہ جلدی یاد کرنے کے باوجود اُنھیں قرآن مجید یاد ہے اور وہ مقامات بھی پختہ ہیں۔

استاد جی فرماتے تھے کہ ان کا ہر سال کا معمول تھا کہ وہ تراویح پڑھانے کے بعد ختم والی

رات سائیکل پر اپنے حفظ کے استاد کے گھر جاتے تھے، ان سے ملاقات کرتے تھے اور اُن سے دعائیں لیتے تھے۔ ایک مرتبہ ان کے استاد اُن سے کہنے لگے: عاصم میاں! کب تک اس طرح آتے رہو گے۔ اس پر اُستاد جی نے اپنے استاد سے کہا کہ جب تک آپ زندہ ہیں یا میں زندہ ہوں، میں آتا رہوں گا۔ اپنے استاد کے بارے میں فرمانے لگے کہ وہ آخری عمر میں صاحبِ فراش ہو گئے تھے اور نماز کے لیے مسجد نہیں جا سکتے تھے اور کہتے تھے کہ ایسی زندگی کا کیا فائدہ جس میں نماز بھی مسجد میں نہیں ہو سکتی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بڑے واقعی بڑے ہوتے ہیں، اور بڑوں کے بڑے بھی بہت بلند مقام و مرتبے کے لوگ گزرے ہوتے ہیں۔

پیکرِ تواضع:

استاد جی کی تواضع ان کا اعجاز تھا۔ اتنی نسبتوں کے امین، عزت و دولت سے مالا مال شخص، صلاح و تقویٰ میں چوٹی کے انسان اور علمی صلاحیت اور اِستعداد کے باوجود، پاکستان بھر کے اور دنیا جہاں کے لوگوں سے واقفیت کے باوجود اور متعدد بڑے بڑے لوگوں اور اِداروں سے تعلقات اور روابط کے ہوتے ہوئے اتنا متواضع ہونا میری سمجھ میں نہیں آتا اور جب بھی میں اس بارے میں سوچتا ہوں ورطۂ حیرت میں ڈوب جاتا ہوں اور کبھی اپنے آپ سے کہتا ہوں کہ کیا ایسا بھی ممکن ہے؟ کیا ایسا بھی ہو سکتا ہے؟ استاد جی عجائب و غرائب کا مجموعہ تھے اور جتنا انھیں دیکھا جائے اور اُن کے بارے میں سوچا جائے اتنا ہی تعجب میں مبتلا ہو جانا یقینی تھا۔ یہ معلوم ہو جاتا تھا کہ استاد جی واقعی بزرگوں کے صحبت یافتہ اور نقشبندیہ سلسلے کی نسبت کے حامل اور حقیقی حق دار ہیں۔

ایک مرتبہ صادق آباد کے کسی طالب علم سے کہنے لگے کہ تم وہاں اتنا نہیں گھومے ہو گے جتنا میں وہاں گھوما ہوں اور میں نے وہاں کے اسٹیشنوں کے چکر لگائے ہیں۔ میرے شیخ مولانا ادریس انصاری رحمۃ اللہ علیہ وہاں کے تھے۔

استاد جی فرماتے تھے کہ مجھے بیان کرنا نہیں آتا، اس لیے کبھی بیان نہیں کرتا، حالاں کہ یہ محض ان کی عاجزی تھی، ورنہ جس شخص کو اِتنی زبانوں پر عبور حاصل ہو، اردو مادری زبان ہو، ایک بہترین مدرس ہو، قرآن مجید پختہ یاد ہو، فی البدیہہ اشعار، واقعات اور لطیفے سنا سکتا ہو اور وظائف بتا سکتا ہو، اتنی دنیا کا سفر کر چکا ہو، لوگوں میں ترغیبی بات کر سکتا ہو، اس شخص کے لیے مجمع میں بیان کرنا کیا مشکل بات تھی؟ اسی طرح اتنی قادر الکلامی کے باوجود اور دولت واَسباب کے تمام تر وسائل کے ہوتے ہوئے، یہاں تک کہ اپنا ذاتی مکتبہ ہوتے ہوئے کوئی تالیف وتصنیف کا نہ ہونا کیا حیرت انگیز بات نہیں؟ تصنیف وتالیف تو دُور کی بات ہے، ان کے لکھے مضامین اور کتابوں پر لکھی گئی ان کی تقاریظ بھی بہت کم ملیں گی۔ ان میں حقیقی تواضع تھی۔ اہل تصوف کہتے ہیں کہ انسان کی ''میں'' سب سے آخر میں مرتی ہے اور یہ ولایت کا اعلیٰ ترین درجہ ہے، جب انسان یہ سمجھنا چھوڑ دے کہ میں کچھ ہوں۔

قارئین! ان تمام باتوں کو سامنے رکھ کر خود یہ یقین کر سکتے ہیں کہ استاد جی اس مرتبے پر فائز تھے۔

ایک مرتبہ استاد جی کی گاڑی خراب تھی تو احقر نے اپنی گاڑی میں استاد جی کو اُن کے خادم سمیت ان کے گھر پہنچایا۔ راستے میں بھی بڑی خوش طبعی فرماتے رہے۔ میرے خالو عبدالستار پردیسی کا گھر اُستاد جی کے گھر کے بہت قریب تھا، وہ اگرچہ دبئی میں رہتے ہیں، لیکن استاد جی سے ان کا اچھا تعلق تھا۔ راستے میں مجھے کہنے لگے کہ آپ کے بہنوئی اور خالو سے میرا بہت اچھا تعلق ہے اور اُن کی خیر خیریت معلوم کرنے لگے۔ اسی طرح استاد جی کا اپنے تمام متعلقین سے بے لوث تعلق تھا اور اُن کی خیریت معلوم کرنے کا معمول تھا، حالاں کہ میں خود اِس بات کا گواہ ہوں کہ بڑے بڑے دنیا دار لوگ بھی استاد جی کا نام بہت ادب و اِحترام سے لیتے تھے اور اُستاد جی کو اپنا شیخ مانتے تھے۔ اگر اُستاد جی کے ذریعے سے ان کے پیسے کہیں لگ جائیں تو وہ اسے اپنے لیے سعادت سمجھتے تھے اور اُستاد جی پر مکمل اعتماد کرتے تھے۔

میں اس معاملے میں کش مکش میں رہتا تھا کہ کسی اور کے ساتھ تعاون کے لیے مخیر لوگوں سے کہنا چاہیے یا نہیں، میں نے بکثرت بڑوں سے سنا تھا کہ کم از کم کسی عالمِ دین کو ایسا نہیں کرنا چاہیے، اس سے اُس کے وقار اور رُعب میں کمی آتی ہے اور اِس بات کا تجربہ بھی ہو چکا تھا، اس میں ایک طرف دوسروں کی خاطر اپنی اور مولویت کی عزت کو داؤ میں لگانے کا پہلو نظر آتا تھا تو دوسری طرف تکلیف میں مبتلا انسانیت نظر آتی تھی اور یہ بھی سوچنا پڑتا کہ ہم اکیلے کسی شخص یا ادارے کے ساتھ کتنا تعاون کرلیں گے، کسی کو ساتھ ملانے سے بہت آسانی ہوجاتی ہے۔ اس کا حل بھی مجھے استاد جی کی ذات بابرکت میں مل گیا۔ استاد جی کے رویے سے میں نے جو نتیجہ نکالا وہ یہ تھا کہ اگر کسی کا آپ کے ساتھ اتنا دوستانہ اور عقیدت پیدا ہوجائے کہ آپ کو یقین ہو کہ وہ بُرا محسوس نہیں کرے گا اور وہ آپ کو خود کہہ بھی چکا ہے، بل کہ بار بار کہتا ہو کہ مجھے اپنے مال کا کوئی درست مصرف بتائیں تو اِس موقع پر کہہ دینے میں کوئی مضائقہ نہیں، بل کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بھی ایسا کرنا ثابت ہے اور اِس میں اس مخیر شخص کے ساتھ بھی تعاون ہے، جسے پیسے خرچ کرنے کا ایک اچھا اور معتمد مصرف مل جاتا ہے اور وقت، کام اور جذبے کو دیکھتے ہوئے ایسے انسان کو زندگی میں ایسے بے تحاشا لوگ مل جاتے ہیں جس کا میں خود بھی مشاہدہ کر چکا ہوں۔

بہر حال، گھر آجانے پر اُستاد جی نے گاڑی کی اپنی جانب کا شیشہ اور پیچھے کا شیشہ بھی خود بند کیا۔ میں نے استاد جی سے کہا کہ میں بند کرلوں گا، لیکن اس کے باوجود اُستاد جی نے شیشہ بھی بند کیا اور لاک بھی خود لگایا۔ دوپہر کا وقت تھا، استاد جی نے مجھے گھر آنے کی دعوت دی۔ میں نے تکلفانہ طور پر کہہ دیا کہ ان شاء اللہ! پھر آؤں گا، اس کے بعد وہ موقع جمعے کی رات ۱۷ ربیع الثانی ۱۴۴۲ھ، مطابق ۳ دسمبر ۲۰۲۰ء کو ہی ملا جب آہیں بھرتے ہوئے استاد جی کے گھر کی دہلیز پر پہلی بار قدم رکھا اور وہ بھی استاد جی کے آخری دیدار کے لیے۔ امت کا غم اور ہمیشہ ان کے دل میں پائی جانے والی تڑپ دیکھ کر میں یہ یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ علالت کے ان دنوں میں بھی

استاد جی کو اپنی بیماری کی اتنی تکلیف نہیں ہوگی جتنی انھیں دین اور اِنسانیت کا غم کھا رہا ہوگا۔ جہاں استاد جی ایک ولی اللہ اور عابد تھے وہاں ایک سماجی خدمت گزار اور دکھی دلوں کا سہارا بھی تھے۔

گوری سووے سیج پر مکھ پر ڈارے کیس
چل خسروؔ گھر آپنے رین بھئی چھوں دیس

ایک عاشقِ قرآن:

استاد جی انتہائی دل سوز لہجے میں قرآن مجید کی تلاوت کرتے تھے۔ علالت سے پہلے دس روزہ تراویح بھی خود ا کیلے پڑھاتے تھے، پھر جب علیل رہنے لگے تو ایک پارہ پڑھانا شروع کیا اور اُس کے بعد مزید کم کرنا پڑا۔ طویل عرصے تک ایک بڑے مجمع اور مشائخ اور طلبہ وحفاظ کے سامنے روزانہ اطمینان سے تین پارے تلاوت کرنا انتہائی غیر معمولی بات تھی۔ اس کے علاوہ استاد جی رمضان میں اکثر اپنے سامع کو صبح سویرے جامعہ بنوری ٹاؤن کی مسجد کے برآمدے میں قرآن مجید سنا رہے ہوتے تھے۔

استاد جی ایک دن دوران سبق میں فرمانے لگے کہ طالب علمی کے دور میں ایک مرتبہ بریلویوں کی کسی مسجد سے میرا گزر ہوا، جس میں حسنِ قراءت کا مقابلہ چل رہا تھا۔ میں اس میں ایک اجنبی کی طرح شامل ہوگیا اور اُس میں پہلی پوزیشن حاصل کر لی۔

یہ بات جہاں ان کے ایک اچھے قاری ہونے کا ثبوت ہے وہیں ان کی خوش طبعی اور اعلیٰ ذوق کی بھی علامت ہے۔ استاد جی کہنے لگے: جو لوگ کہتے ہیں کہ فلاں بزرگ بچپن میں ایسے نیک تھے ویسے نیک تھے، ان کی باتوں پر زیادہ اعتماد نہ کیا کرو، ہم تو بچپن میں بہت ہی شرارتی تھے۔

ایک مرتبہ جماعت میں مصری قاریوں کی نقل کر کے اس بارے میں کہنے لگے کہ اس سے بچو، لوگوں نے اسے کاروبار بنا لیا ہے۔ مصری قاریوں کو بلاتے ہیں، پروگرام کرواتے ہیں اور اِس

کے ذریعے لاکھوں روپے کماتے ہیں۔ اس میں نام ونمود ہے، اس میں اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوش نودی نہیں ہے۔ ایک انھیں مصر سے بلاتا ہے، دوسرا اُن کا آگے سودا کرتا ہے اور وہ تیسرے سے سودا کرتا ہے اور اِس طرح ہر کوئی لاکھوں روپے کما لیتا ہے۔ اس میں اخلاص کہاں رہ گیا؟ یہ قاری راتوں کو دیر دیر تک محفلیں قائم کرتے ہیں اور صبح فجر کی نماز میں ان میں سے ایک قاری بھی نظر نہیں آتا۔

یکتائے زمانہ عاشقِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم:

درس گاہ میں جب بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نام آتا تو بہت ادب واِحترام سے نام لیتے تھے اور ہر مرتبہ درود شریف پڑھنے کی تلقین فرماتے تھے اور نہ پڑھنے پر بُرا محسوس کرتے تھے۔ استاد جی اکثر یہ درود شریف پڑھتے تھے:

یا ربّ! صلِّ و سلِّم دائما ابدًا
علی حبیبِك خیرِ الخلق کلِّهِمِ

اس کے علاوہ ایک مرتبہ یہ درود شریف ہمیں سکھایا:

جَزَی اللہُ عنا محمدًا ﷺ ما ھو أھلهٗ

اور اِس کی فضیلت بیان کی کہ ایک مرتبہ اس درود شریف کے پڑھنے کی فضیلت یہ ہے کہ ستر فرشتے ایک ہزار دن اِس کا ثواب لکھ کر تھک جاتے ہیں، لیکن پھر بھی اس کا ثواب پورا نہیں ہوتا اور فرمایا کہ اردو کی تفسیر مظہری کے حاشیے میں اس کا حوالہ موجود ہے اور مجھے اسے تلاشنے کا حکم دیا۔

ایک اور درود شریف جو ہمیں استاد جی نے سکھایا، وہ یہ تھا:

اللھم صل علیٰ محمد النبی عدد من صلی علیه من خلقك و صل علی محمد النبی کما ینبغی ان نصلی علیه و صل علی محمد النبی کما امر تنا ان نصلی علیه۔

درود شریف کی فضیلت پر اُستادِ محترم نے ایک مرتبہ دو واقعات سنائے تھے۔ ایک واقعہ یہ سنایا تھا کہ ایک شخص انتہائی مقروض تھا اور اُس نے بہت سے لوگوں سے قرضہ لیا ہوا تھا۔ ایک مرتبہ اس کے ذہن میں یہ بات آئی کہ کسی شخص سے بڑی رقم قرضہ لے کر سب کی رقم چکا دیتا ہوں، اس طرح زیادہ لوگوں کے سامنے شرمندہ ہونے سے بچ جاؤں گا۔ چناں چہ اس نے ایسا ہی کیا۔

جب وہ شخص قرضہ لینے گیا تو جس سے قرضہ لے رہا تھا اس نے ضامن طلب کیا، اس پر اس شخص نے کہا کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو ضامن بناتا ہوں۔ اس پر وہ شخص چونک گیا اور اُس نے اتنی رقم اسے بطورِ قرض دے دی۔

کچھ عرصے بعد اُس نے مطالبہ شروع کیا اور عدالت تک نوبت پہنچ گئی۔ اس شخص کے پاس قرضہ چکانے کے لیے کوئی رقم نہیں تھی۔ اس نے قاضی سے ایک دن کی مہلت مانگی۔ قاضی نے بھی اس سے ضامن طلب کیا تو اُس نے کہا کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو ضامن بناتا ہوں۔

اس کے اس جملے پر قاضی بھی دنگ رہ گیا اور اُسے ایک دن کی مہلت دے دی۔ گھر آ کر وہ شخص پریشان بیٹھ گیا اور اپنی بیوی کو سارا ماجرا سنایا۔ اس کی بیوی نے اس سے کہا کہ جب تم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو ضامن بنایا ہے تو کیوں نہ ہم آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر درود وسلام بھیجیں۔ میاں اور بیوی، دونوں مل کر درود شریف پڑھنے لگے اور درود شریف پڑھتے پڑھتے سو گئے۔

اگلے دن قرض خواہ ان کے گھر پہنچ گیا، ان کا دروازہ کھٹکھٹایا اور باہر آنے پر اُنھیں اتنے ہی پیسے دیے جتنے انھیں قرض کے طور پر دیے تھے اور قرض بھی معاف کر دیا اور کہنے لگا: مجھے رات کو خواب میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی زیارت ہوئی ہے اور مجھے حکم ہوا ہے کہ آپ کا قرضہ معاف کر دوں۔

اس کے بعد وہ دونوں قاضی کے پاس تشریف لے گئے۔ قاضی کو بھی رات میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی زیارت ہو چکی تھی اور اُسے بھی آقا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے یہی فرمایا تھا کہ انھیں معاف کر دیا جائے۔ قاضی نے بھی اس شخص کو اتنی ہی رقم انعام کے طور پر دی اور اُسے بری کر دیا۔

ایک اور واقعہ جو اِسی نشست میں استاد جی نے سنا کر سب طلبہ کو پانی پانی کر دیا تھا، وہ یہ تھا کہ ایک مسلمان شخص ہمیشہ کہتا رہتا تھا کہ درود شریف پڑھا کرو، تمھارے سارے کام آسان ہوجائیں گے۔ ایک یہودی اس کا پڑوسی تھا، اسے اس بات سے چڑ ہونے لگی اور اُس نے اسے آزمانے کا سوچا۔ اس نے ایک مرتبہ ایک قیمتی انگوٹھی اس مسلمان کو اَمانت کے طور پر دی، پھر خود ہی اس کے گھر سے وہ انگوٹھی چرائی اور اُسے سمندر میں پھینک دیا اور اُس کے بعد وہ مسلمان کو ذلیل کرنے کے ارادے سے اس کے گھر پہنچ گیا اور اپنی انگوٹھی مانگنے لگا۔

مسلمان نے کہا کہ ٹھہرو، پہلے تمھاری میزبانی تو ہوجائے۔ وہ بازار سے مچھلی لے کر آیا اور اُسے کاٹنے لگا۔ اسی میں سے اس یہودی شخص کی انگوٹھی بھی نکل آئی۔ مسلمان نے اس یہودی کا اکرام بھی کیا اور اُس کی انگوٹھی بھی اسے دی۔ یہودی اپنی انگوٹھی دیکھ کر حیران ہوگیا اور پوچھا کہ تمھیں یہ انگوٹھی کہاں سے ملی؟ اس نے کہا کہ نہ جانے کس طرح یہ انگوٹھی مچھلی کے اندر چلی گئی تھی، مچھلی کاٹی تو اُس میں سے یہ انگوٹھی بھی نکل آئی، اس پر اُس یہودی نے سارا قصہ بیان کیا اور وہ اسی وقت کلمہ پڑھ کر مسلمان ہوگیا۔

وہ شعر جو بکثرت استاد جی سے سنا: ؎

حسنِ صورت چند روزہ ، حسنِ سیرت مستقل
اِس سے خوش ہوتی ہے آنکھیں ، اُس سے خوش ہوتا ہے دل

استاد جی کی زبان سے سنے چند محاورے اور ضرب الامثال:

کردن صد عیب نہ کردن یک عیب

جادو وہ ہے جو سر چڑھ کے بولے

اونچی دکان پھیکا پکوان

الناس علی دین ملوکھم

سل المجرب ولا تسال الحکیم

The first impression is the last impression

میرے جیسے نالائق اور برائے نام خود کو طالب علم کہنے والے شخص کے لیے ان سب باتوں سے بالاتر بات یہ تھی کہ استاد جی اتنی بڑی ہستی ہونے کے باوجود مجھ سے رابطہ رکھتے تھے۔ صرف یہی نہیں کہ ان سے رابطہ رکھنا آسان تھا، بل کہ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ وہ خود رابطہ کرتے تھے۔ میری چیزوں کو دیکھ کر خوش ہوتے تھے اور دعائیں بھی دیتے تھے۔

قارئین کرام!

ان چند اوراق میں، میں نے صرف وہ باتیں ذکر کی ہیں جو میں نے استاد جی سے خود سنیں یا ان سے میرا کسی طرح واسطہ رہا، ورنہ استاد جی کے کمالات پر بے شمار باتیں ہیں جن سے پردہ اٹھنا ابھی باقی ہے۔

کبھی میں اپنے آپ سے کہتا ہوں کہ سعد! روتے کیوں ہوں؟ وہ تو بے مثال زندگی گزار کر چلے گئے۔ آخر تک اپنے آپ کو بڑائی اور تکبر سے محفوظ رکھا اور کام کرتے رہے، وہ تو اِن شاءاللہ! حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دستر خوان پر صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اور اکابر کے ساتھ جنت کے میوے تناول فرما رہے ہوں گے، اپنی فکر کرو اور اپنے ایمان کو بچاتے ہوئے جب تک سانس ہے کام میں لگ جاؤ۔

اللہ پاک ہمیں ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق نصیب فرمائے اور جنت میں ہمیں ان پاک باز ہستیوں کی رفاقت نصیب فرمائے۔ آمین۔

محبت معنی و الفاظ میں لائی نہیں جاتی
یہ وہ نازک حقیقت ہے جو سمجھائی نہیں جاتی

میرے مرشد و مربی

علمائے دیوبند اور مشائخ طریقت میں ایک معروف نام میرے مرشد و رہبر حضرت مولانا شمس الرحمن العباسی دامت برکاتہم العالیہ کا ہے۔ اللہ پاک ان کا سایہ ہم پر تا دیر قائم رکھے۔ آمین۔

حضرت والا ہمارے اکابر کا اِعتماد اور بھروسا ہیں۔ ان کی ایک نشانی اور پہچان ہیں۔ ان کی بزرگی اور برگزیدہ پن کا ایک ثبوت ہیں۔ ان کا ایک رنگ ہیں، گویا کہ کئی اکابر کا مجموعہ اپنے اندر سموئے ہوئے ہیں۔ کئی اکابر کے مزاج، انداز، اخلاق کا پرتَو اور عکس ان میں واضح نظر آتا ہے۔ وہ علم اور تقوی میں ان کے حقیقی وارث اور جانشین ٹھہرتے ہیں۔

حضرت والا کا نام پیر طریقت شیخ عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے شمس الرحمن رکھا۔ وہ اس طرح کہ حضرت کی پیدائش پر آپ حضرت والا کی دادی کے خواب میں تشریف لائے اور کہا کہ اس بچے کا نام شمس الرحمن رکھنا۔

مجھے اندازہ نہیں کہ میں اپنی کم مائیگی اور بے اثر قلم کے ساتھ کیسے ایسی عظیم شخصیت کے متعلق رقم طراز ہوں۔ میرے پاس ایسا کوئی قلم ہی نہیں اور مجھے نہیں پتا اگر میں ایسے قلم کی تلاش میں ساری دنیا چھان لوں تو بھی اسے پاسکوں گا یا نہیں جو حضرت والا کی صفات کو اُن کے شایانِ شان لکھ سکے۔

اور نہ ہی میں ایسی زبان کا مالک ہوں یا تحریر کا حامل ہوں جو اِس عظیم امر کا حق ادا کر سکے، لیکن جب لکھنے کا عزم کر ہی لیا ہے تو پیچھے ہٹنا بھی مناسب معلوم نہیں ہوتا، لہٰذا بغیر قلم و لسان کے ہی آغاز کر رہا ہوں۔

حضرت والا نے سن ۱۹۵۱ء میں عباسی خاندان، یعنی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا کے گھرانے میں آنکھیں کھولیں اور وہ بھی ایسے گھرانے میں جو بڑے علما اور اولیائے کرام کا گھرانا سمجھا جاتا تھا۔ بچپن ہی سے دینی تربیت پاتے رہے اور گیارہ سال کی عمر میں جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی سے وابستہ ہو گئے اور اُنیس سال کی عمر میں درسِ نظامی مکمل کر کے سند فراغت حاصل کی۔ حضرت والا، محدث عصر مولانا یوسف بنوری، مفتی ولی حسن ٹونکی اور مولانا فضل محمد سواتی رحمۃ اللہ علیہم کے خاص شاگرد رہے اور چار بڑے مشائخ سے حضرت والا کو اِصلاح و اِرشاد کے سلسلے میں خلافت کی سعادت بھی حاصل ہے۔ وہ پانچ مشائخ حضرت مولانا عبدالغفور مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے بیٹے مولانا عبدالحق مدنی رحمۃ اللہ علیہ، مولانا علی مرتضیٰ خلیفہ مجاز مولانا عبدالغفور مدنی، مولانا لطف اللہ عباسی خلیفہ مجاز مولانا عبدالغفور مدنی، صوفی اقبال مدنی اور شیخ عبدالحفیظ مکی صاحبان خلیفہ مجاز حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا رحمۃ اللہ علیہم ہیں۔

حضرت والا کئی سال سے غفوری مسجد، سولجر بازار میں امام ہیں اور وہیں حضرت والا کا قائم کردہ مدرسہ اور خانقاہ بھی ہے۔ حضرت والا بہت زیادہ خلوت پسند اور متواضع ہیں، اسی لیے خلافت اور تمام تر نسبتوں اور اپنے دادا چچا مولانا عبدالغفور مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی مسجد و خانقاہ میں ہونے کے باوجود حضرت والا نے ایک عرصے تک خانقاہی سلسلے کا آغاز نہیں کیا۔ عرصے بعد چند بشارتوں اور بالخصوص صوفی اقبال مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے اصرار پر سلسلے کا آغاز کیا اور باقاعدہ خانقاہ کی بنیاد ۲۲ صفر ۱۴۲۴ھ، مطابق اپریل ۲۰۰۳ء میں مولانا عبدالحفیظ مکی رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھوں ڈالی گئی۔ اس وقت سے اللہ تعالیٰ کے طلب گار بندے جوق در جوق خانقاہ کا رُخ کرتے ہیں اور اِس چشمے سے سیراب ہوتے ہیں، تاکہ ان کے قلوب کو حیات حقیقی حاصل ہو جائے اور ایمانی قوتوں سے وہ مالا مال ہو جائیں۔

کئی لوگ جو گناہوں کی دلدل میں بُری طرح پھنس چکے ہوتے ہیں اور اپنے دلوں کو بُرائیوں سے سیاہ کر چکے ہوتے ہیں وہ یہاں آ کر اوروں کے لیے مشعل راہ بن کر نکلتے ہیں۔ یہاں قلوب کی حقیقی صفائی کا سامان مفت میسر ہے اور اہل اللہ کی صحبت کی دولت یہاں ملتی ہے۔ ابھی بھی یہ

اصلاح باطن اور تصفیۂ قلوب کا مرکز موجود ہے اور معاشرے میں اپنا بھرپور کردار اَدا کر رہا ہے۔

حلیہ: درمیانہ قد، بدرِمنیر کی طرح چمکتا روشن چہرہ، کشادہ پیشانی، سفید، گھنی اور ملائم داڑھی جو کہ بزرگی کی نشانی ہے، نرم ہاتھ، سفید لباس اور سفید پگڑی۔

صفاتِ حمیدہ: صبر، برداشت، نرمی، سنتوں کی پابندی، عبادت میں حرص، سفر و حضر میں معمولات کی کثرت، ہر وقت ذکر، میٹھا لہجہ، مثالی سخاوت، غریب و امیر، ہر ایک کی قدر، اکرام و اِحترام، منصب شناسی، راز دان، غم خوار، اللہ کی خاطر محبت و وفا۔ حضرت والا ان ساری صفات، بل کہ ان کے علاوہ بھی کئی خوبیوں کا پیکر ہیں۔

لہٰذا میں اپنے محترم قارئین سے یہی عرض کروں گا کہ دیر نہ کریں۔ وقت بہت جلدی گزر جاتا ہے اور زندگی کا کوئی اعتبار نہیں، نہ ہماری زندگی کا کچھ پتا ہے اور نہ ہمارے مشائخ کی زندگی کی کوئی خبر ہے۔

لہٰذا آگے بڑھیے اور جلدی کیجیے۔ ہم میں سے ہر ایک اللہ تعالیٰ کی محبت و معرفت میں سے اپنے نصیب کو ضرور حاصل کرے، کیوں کہ یہ ایک ایسا دَر ہے جہاں سے کوئی خالی ہاتھ نہیں لوٹتا۔ خود جا کر ملیے، تا کہ آپ میری اس بات کی تصدیق پر آمادہ ہوں کہ میں نے جو کچھ بھی لکھا ہے، وہ واقعی کم اور اُن کی شان کے لائق نہیں ہے۔

حجت، ماہرینِ فن کا قول ہے

دنیا میں ہر ذی شعور آدمی اپنے علم میں اضافے اور حاصل کیے ہوئے علم میں مزید ترقی کے لیے کسی راہ بَر اور راہ نما کا متلاشی رہتا ہے جو اُس کی بہتر اور صحیح راہ نمائی کر سکے اور کامل راہ نمائی اسی وقت ممکن ہے جب راہ نمائی کرنے والا خود بھی اس علم میں کامل ہو۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝

اور عربی کا مقولہ ہے: فاقد الشیء لا یعطي، جو کمال کی ضرورت پر دلالت کرتا ہے۔

اس آیت سے کئی دنیا اور دِین کے مسائل متفرع ہوئے ہیں۔ آپ تو یقیناً جانتے ہوں گے کہ پانی کی گہرائی کا سوال اس شخص سے نہیں کرتے جو کبھی اس میں گیا ہی نہ ہو اور جو سوال کرے وہ خود ہی ملامت کا مستحق ہوگا۔

کسی حکیم فلسفی نے کیا خوب کہا ہے کہ اگر نان بنانا سیکھنا ہے تو نان بائی سے سیکھو اور اگر تجارت کرنا سیکھنی ہے تو تاجر سے سیکھو، ان کے علاوہ اپنا سر مت مارو۔ اسی طرح میرے دوستو! اگر علمِ دین سیکھنا ہے تو علما سے سیکھیں۔

عجیب مزاج ہے ہمارا کہ دنیا کے امور میں تو ہمارا تر از و ٹھیک ہی رہتا ہے، مگر دین کے معاملے میں ہم اس کا خیال نہیں رکھتے۔

ہم طلبہ سے متعلق ایک اور بات بھی مدنظر رکھیے کہ جس طرح پانی سبب حیات ہے اسی طرح ہر فن میں مہارت کا سبب اپنے آپ کو اُس میں لگا دینا اور محو کر دینا ہے۔ اس کے بغیر آدمی اس فن کا عالم تو بن سکتا ہے، مگر اِمام نہیں بن سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ ایک آدمی ایک وقت میں تمام فنون کا امام

نہیں بن سکتا، اگرچہ اس فن کے متعلق بنیادی رائے کا حامل ضرور ہوسکتا ہے۔ اب فن تجوید میں قاری کا قول حجت ہے، فن حدیث کے ماہر کا نہیں اور حدیث کے معاملے میں قاری کی رائے کالعدم ہے، بشرطے کہ انھوں نے اس فن میں بھی مہارت حاصل کر رکھی ہو۔

اور یہ یاد رہے کہ وہ حامل رائے کسی رائے پر قائم ہونے میں غلطی پر نہیں ہے، مگر ہمیں اپنے مقاصد میں سرخ روئی حاصل کرنے کے لیے اس قاعدے کا خیال رکھنا چاہیے۔

أسأل الله تعالیٰ ان یوفقنا للصواب و السداد و بالله التوفیق

مغرب اور اُس کی دوغلی سیاست

(رپورٹ)

یہ دوغلا پن ہی ہے جس پر زمانے سے اہل مغرب اور اُس کے بغلی بچے یہود کی سیاست قائم ہے۔ اس مہلک ہتھیار کے ذریعے وہ ساری دنیا پر بلا شرکت غیرے اپنی حکمرانی کا خواب دیکھ رہے ہیں۔ دوغلا پن اس سیاست کا جزوِ لاینفک بن چکا ہے۔ ان کی اسلام مخالف سیاست کا عملی مظاہرہ آئے دن دنیا دیکھتی رہتی ہے۔ اس دوغلی سیاست کے بغیر اِن کا خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہوسکتا۔ اسلام اور مسلمانوں کو وہ اپنے راستے کا سب سے بڑا کانٹا سمجھتے ہیں، اسے ہٹانے کے لیے وہ سب کے سب ایک صف میں آچکے ہیں اور اِس مذموم مقصد کی تکمیل کے لیے اپنی قوت زر اور قوت باز و خرچ کرنے میں بالکل بھی دریغ نہیں کرتے۔

اس پس منظر میں دنیا ان کے دوغلے پن کی تازہ مثال کا مشاہدہ کر چکی ہے۔ اپنی اس دشمنی میں وہ انتہا کو پہنچ چکے ہیں اور بلا جھجک اسے آزادیِ اظہارِ رائے کا نام دیتے ہیں۔ چارلی ہیبڈو، ایک فرانسیسی طنزیہ و مزاحیہ میگزین ہے، جس کی اشاعت کچھ دنوں پہلے تک انگلیوں پر گنی جاسکتی تھی، لیکن جوں ہی اس نے اسلام کو نشانہ بنایا اور سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے توہین آمیز خاکے شائع کیے وہ اہل مغرب کی آنکھوں کا تارا بن گیا اور میگزین ہاتھوں ہاتھ بکنے لگا۔ اسے بھی انھوں نے آزادیِ اظہارِ رائے کے سانچے میں ڈھالنا چاہا۔ یہ وہی ملک فرانس ہے جس نے چند سال قبل اس طرح کے واقعے کے تحت برقع پر اور راستے میں نماز پڑھنے پر پابندی لگائی، پھر جب خود اپنے اس کیے کے بدلے سترہ لاشیں اٹھائیں تو ایک پریڈ قائم کیا جو بھی اسی آزادیِ اظہارِ رائے

کے عنوان کے تحت تھا۔

البتہ اسی حادثے کے ذیل میں مسجدوں اور اسلامی اسکولوں میں ہونے والے ۵۴ حادثات کا ذکر بھی نہیں کرتے۔ یہ ۲۰۰۵ء میں ڈنمارک کے رسالے ''جیلانڈز پوسٹن'' کے بعد دوسرا بڑا واقعہ پیش آیا ہے کہ مغرب نے توہین نما خاکے چھاپے ہیں۔ اگر اس کی ڈور کو نہ کاٹا جائے اور اس کے خلاف سخت لائحۂ عمل اختیار نہ کیا جائے تو معاملہ حد سے تجاوز کر سکتا ہے۔ عجیب بات ہے کہ فلسطین کے ۲۵۰۰ مسلمانوں اور اس کے علاوہ سات صحافیوں کو قتل کروا کر خاموش رہنے والا یہودی صیہونی ''بنیامین نیتن یاھو'' ان بارہ فرانسیسی صحافیوں کے لیے منعقد پریڈ میں شریک اظہارِ افسوس کر رہا ہے۔

یہ آزادی رائے کے دعوے دار خود کیوں اپنے مذہب کی مخالف اشاعتوں کو روکتے ہیں کہ ڈنمارک کی سوپر مارکیٹ کویکلی (Kviekly) سے وہ جوتے، جن پر مسیح علیہ السلام اور بی بی مریم کی تصویر بنی تھی، اٹھوالی گئیں؟ وہ فلمیں جو اُن کے مذہب، عیسائیت و یہودیت کے مخالف ہوں انھیں سنسر (Censor) کر دیا جاتا ہے۔ اسی فتنۂ جدیدہ رسالہ چارلی ہیبڈو کو لیجیے، جس نے ۲۰۰۸ء میں خود ہی اپنے ایک فرانسیسی خاکا نگار مورس سینٹ (Maurice Sinet) کو ایک سام دشمنی پر مشتمل خاکا بنانے کی وجہ سے نوکری سے نکال دیا تھا، جو کہ یہودیوں کے قتل عام کا نظریہ ہے، جس کا حامل ہٹلر تھا اور رسالہ جیلانڈز پوسٹن نے عیسائیت اور یہودیت کے خلاف خاکے بنانے سے منع کر دیا تھا، لیکن مسلمانوں کے مذہب کے بارے میں کچھ نہ کہا۔ کیا ان کا دعوی آزادیِ رائے صرف مسلمانوں پر آ کر بند ہوتا ہے!؟

اس دعوے کے صدر امریکا کو لیجیے کہ اس کا صدر اوباما یمنی صحافی عبداللہ حیدر کو ڈرون کے خلاف لکھنے پر جیل میں قید رکھنے کا مطالبہ کرتا ہے۔ نہ جانے کس جگہ پر ختم ہوں گے ان کے یہ جھوٹے آزادیِ رائے کے دعوے۔ فرانس اور جرمنی وہ ملک ہیں جو برطانیہ کے ساتھ مساوات کا

دعوی کرتے ہیں اور اِن کے ملک میں مسلمان بدترین طریقے سے زندگی بسر کرتے ہیں۔ ان کی تعلیم اور کاروبار اور معاشرتی زندگی میں بھی فرق کیا جاتا ہے۔

اور کیا آنکھوں سے اوجھل رہ سکتا ہے کہ کس طرح امریکا مسلمانوں کو دہشت گرد اور وحشی ظاہر کرتا ہے اور خود اپنے قدم کتنے ہی مسلمان ملکوں میں رکھ چکا ہے اور وہاں کیسے کیسے ظلم ڈھا رہا ہے اور لوٹ مار کر رہا ہے کہ جس کا حساب بھی ممکن نہیں۔ اپنے دہشت گردی کے خاتمے کے دعوے میں القاعدہ کے پیچھے، بل کہ اس کے نام سے کیا کیا دہشت گردیاں کر رہا ہے۔ اب یہ عراق، پاکستان، یمن، افغانستان، سب ہی میں اپنے ڈرون حملے بڑھا رہا ہے اور صومالیہ، موریتانیا اور جنوبی الجزائر میں بھی داخل ہو گیا ہے اور چوں کہ آگ بھڑکانے سے بڑھتی ہے، کم نہیں ہوتی، دہشت گردی جو پہلے گویا تھی ہی نہیں، اب روز بروز بڑھتی چلی جارہی ہے۔

انسانی حقوق کے ساتھ ساتھ جانوروں کے حقوق کا بھی مدّعی معصوم مسلمانوں، عورتوں اور بچوں کو اُن کے گھروں سمیت ہلاک کر رہا ہے۔ آئے دن فلسطین سے اٹھنے والے سپوتوں کی لاشیں، محترم ماؤں بہنوں کی بے حرمتی ان کی اس حقیقی وحشت کا کھلا ثبوت ہے۔ کیا ان کی جانوں کی کوئی قیمت نہیں؟! جب کہ اس کے مقابلے میں اگر کسی یہودی یا اسرائیلی کو کانٹا بھی چبھ جاتا ہے تو یک صف ہو کر لڑنے کو تیار ہو جاتا ہے۔ یہ تو بڑا عجیب انصاف ہے، انوکھی مساوات ہے اور بہت انوکھا آزادیِ رائے کا فلسفہ ہے!

درحقیقت یہی دوغلا پن اس مغرب کا طرّہ امتیاز اور اسلحہ و ہتھیار ہے، جس سے یہ صلیبی صیہونی مغرب، اسلام اور مسلمانوں کے خلاف منصوبہ بناتا ہے اور میڈیا کے ذریعے اسے عمل میں لاتا ہے۔ ویسے تو ہر چیز عمدہ ہے، درست ہے، جب تک ان کے مصالح حاصل ہو رہے ہوں اور بُری ہے، فاسد ہے اگر اُن کے فوائد کے درمیان حائل ہو۔

سيدي ومولائي

شمس الرحمٰن العباسي

حفظه الله ورعاه

هو شمس الرحمن قد طلعت	على العباد البائسين فاستناروا
أنار الأرض بحسناته	شهد بها الأعداء و الأخلاء
زالت به الفتن كلها أو كادت	و لن يزول ما علموا
كم بلغوه من قتيل نفوسهم	و عادوا بصلاح و تقى قد نالوا

من كبار علمائنا الديوبنديين ومشايخ الطرق،سيدي ومولاي شمس الرحمٰن العباسي النقشبندي المؤقر حفظه الله و رعاه۔ هو من اعتمد عليه كبار الأئمة و المشايخ العظام فوافقهم فيما وثقوا به و هو يحل بأعلى درجات التقوى، إذ هو أثر من آثارهم و رافع لواء علمهم وحلمهم، لون من ألوانهم كأنه ما هم جميعهم كانوا قد تبع هؤلآء حذو النعل بالنعل لا تكاد تفرق بينه و بينهم في العلم و الصلاح و التقى۔ وهو وارث لماورثوه من العلم والتقى۔ هو من سماه باسمه الشريف (شمس الرحمان) الشيخ عبدالقادر الجيلاني رحمه الله تعالى، في عالم الرؤيا حيث جاء في رؤيا جدته وأمر بذلك۔ إني لأفقد قلما و لا أعلم إن بحثت عنه في سائر العالم أجده أم لا أكتب به

صفاتِه كما ينبغي و لا أجد لساناً أبينه به كما يليق بشأنه و لكن لما أني أجمعت أمري على أن أكتب فلا أتخلف بل أكتب و لو فاقداً قلماً و عادماً لساناً.

فتح الشيخ عينيه في سلالة متدينة تحتوي على العلماء و الصلحاء عام ١٩٥١ء و ربي تربية إسلامية منذ ذلك اليوم۔التحق بجامعة العلوم الإسلامية و هو ابن ١١ سنة و تخرج و هو ابن ١٩ سنة۔ تلمذ الشيخ على الأساتذة الكبار، منهم محدث العصر الشيخ محمد يوسف البنوري و الشيخ فضل محمد السواتي و المفتى ولى حسن التونكي و كان تلميذا خاصاً لهم و استخلفه أربعة من المشايخ العظام في سلسلة المبايعة والإصلاح و التزكية: فضيلة الشيخ عبد الحق العباسي المدني و الشيخ على مرتضى و الشيخ الصوفى محمد اقبال المدني (خليفة شيخ الحديث زكريا رحمه الله) و الشيخ لطف الله العباسي رحمهم الله، له زاوية فى المسجد الذي يؤم الناس فيه، وضع حجر أساسها الشيخ عبد الحفيظ المكي عام ٢٠٠٣ء من ابريل الموافق ٢٢ من صفر ١٤٢٤ھ و منذ ذلك اليوم، يتوافد عليها عباد الله الظامئون لينالوا من منهلها العذب و لتصبح قلوبهم حية بحب الله بعد أن كانت ميتة، فيستقون و يرتوون و تعود إليهم قوتهم الإيمانية كأنها كانت دنسة بدنائس شتى، فغسلت و نقيت و أصبحت بيضاء صفاء و نقاء و هي إلى الآن مركز لتطهير القلوب و معالجة الباطن.

حليتُه: هو وسيط القامة، ذو وجه منير، يتلألأ تلألؤ البدر عظيمُ الهامة، واسع الجبين أبيض الأشعار و هي علامة مجده ،أزهر اللون، لين

الكفين، يلبس عمامة بيضاء.

و من صفاته الحميدة(و هي كثيرة غيرهذه): صبره و حلمه و مداومته على الأعمال المسنونة وكثرة العبادة سفرا كان حضرا حلو اللسان لين الجانب، كريم الأخلاق ذو الفضل، كثير القدر شكور لا تخشى بوادره و لا يخاف غيظه۔

فأيها القراء المكرمون الأجلاء، لا تتأخروا، فالوقت شيئ زائل و الحياة لا عمدة لها، لا لنا و لا لحياة مشايخنا. فتعالوا و أسرعوا و ليأخذ كل منا نصيبه من حب الله ومعرفته الذي قدره الله له فإنه باب لا يرجع منه أحد خزيان، فشاهدوا ذلك و صدقوني في أن ما كتبته قليل مستوعب لا يؤدي حق البيان كما ينبغي و كما يستحقه شأنه.

و آخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين۔

سيرة الرسول الخاتم ﷺ

السيرة هي بيان طريقة و سلوك شخص و ها أنا أتشرف ببيان سيرة النبي الهادي الذي أضاء الكون و كشف الله به الدجى و هو من يحلو اللسان بذكره و تهدي القلوب بنوره ،ألا وهي سيرة سيدنا محمد ﷺ۔

ومثلي في هذا كمثل من يزيد دلوا بسيطا في اليم، و لا غرو أن هناك أسفارا و مؤلفات ذات مجلدات ضخمة سجلت الوقائع و الأحداث التي عاشها صلى الله عليه و سلم و هذا لا ينقطع ما دام هناك نفس تشهد أنه لا إله إلا الله و أن محمدا رسول الله، و لكن مع هذا كله لا يؤدي جزءا مما أعطي صلى الله عليه و سلم من ربه۔

و هأنا أبدأ في موضوع لا نهاية له متحدثا عن بعض جوانبه مستدلا بالأمثلة الرائعة السامية و هي المثل و الأسس و السبل۔محمد اسم على مسمى، علم على رمز، جمع المحامد و هو أفضل الناس و أقربهم إلى اللّه و حبيب إلى النفوس و رحمة مهداة و نعمة مسداة ،فاللّه محمود و رسوله محمّد! و لقد صدق من قال:

و شقّ له من اسمه ليجلّه   فذو العرش محمود هذا محمد

و كفاه شرفا أن الله قرن اسمه باسمه في كلمة التوحيد الطيبة و بشر به جميع الأنبياء قبله و حُمد فى التوراة و الإنجيل و كتب أخرى سماوية۔و كان

نبينا صلى الله عليه و سلم رحمة للعالمين و هداية له و نسبه يعود إلى كل فخار و مخار و هو من نكاح لا سفاح. نشأ في مكة و كان أميّا ليس له معلّم سوى اللّه تعالى فعلمه الله من لدنه و هدى به قوما جاهلين حتى أصبحوا أعلام الهدى و أرباب العلوم۔ و في سبيل ذلك قاسى صنوف الشدائد فصبر عليها و لم يقف عن دعوته و هكذا شأن كل داع مخلص في دعوته و عند ما غيّر كفار مكة أسلوبهم و قدم إليه لذائذ الدنيا من مال و نساء و ملك مقابل أن يترک دعوته. قال لعمّه أبي طالب: لو وضعوا الشمس في يمينى و القمر في شمالي لا أترك ما بعثت به۔

و هو من آمن بأخلاقه ألدُّ أعدائه و هو قد سامح أفعالهم الشنيعة۔ وإليك أمثال هندة و خالد بن الوليد و كعب بن زهير الذي كان قبل الإسلام يهجو النبي صلى الله عليه و سلم، و بعده يمدحه غاية المدح و من أشعاره:

إن الرسول سيف يستضاء به　　　مهنّد من سيوف اللّه مسلول

وكان أمنا و رحمة أينما ذهب، و قضى على التعصب، و ربى أصحابه في جو المؤاخاة المثالية التي يتحير لها العقول و تتعجب حتى كاد أن تنكرها۔ قد استقبل بأحسن الاستقبال في المدينة فأصبح اسمها من يثرب (اسم لوباء) إلى مدينة النبي ﷺ

طابت به طيبة من بعد الردى　　　أشرق ما قد كان منها أسود
كانت لمن أو بأرض الله　　　فزال داءها بهذا الجاه
و نقل الله بفضل رحمه　　　ما كان من حمى بها للجحفة

وقد آثر الفقر والزهد في الدنيا على عيش نعيم وتوفي و ما اتقد في بيته

موقد من شهرين۔ رغبوه في الدنيا والعيش الرغد فرغب عنها قائلا: مالي و للدنيا. إنما مثلي و مثل الدنيا كمثل راكب قال أي نام في ظل شجرة في يوم صائف، ثم راح و تركها.

كان بعيدا عن الكبر والعجب۔ قال إنما أنا عبد، آكل كما يأكل العبد و أجلس كما يجلس العبد. أتى النبي صلى الله عليه وسلم رجل فكلمه فجعل ترعد فرائصه، فقال له: ''هون عليك، فإني لست بملك۔ إنما أنا ابن امرأة تأكل القديد.''

لعمري إن نبينا ﷺ علم الناس الإنسانية و جعل مادة الطين والماء ذهبا، و أخرجهم من هوة ساحقة إلى قمة العلا، ما شهدت السماء، بل السماوات العلا أفضل منه، و ما وطئ الأرض أكرم على الله منه. إخواني الكرام! هنا يحب علينا أن نسأل أنفسنا هل اتبعناه كما ينبغي، و هل قرت عيناه بإطاعته و هل ثلج صدره بإسلامنا؟ ننال حظا من رحمته۔

يا للأسف! كم فرطنا في حقه! و كم قصرنا في اتباعه و بقينا إنسانا بالجسد و اللحم و الشحم والدم۔ و الحقيقة أن الإنسان بالروح لا بالجسد، و إن كنا نبحث عن القدوة في حياتنا فلنسمع ما يلقي إلينا الوحي ﴿لقد كان لكم في رسول الله أسوة حسنة﴾ و إن كنت تسأل المثل الإنسانية و قد أعياك هذا السؤال و تعز على المجيب الجواب فانظر إلى من طلع ثنيات الوداع فإنك لن تعود خائبا۔

فيا طالب الخير أقبل! (إن في ذلك لذكرى لمن كان له قلب أو ألقى السمع و هو شهيد)۔

و کل ما کتبت هنا في سیرة نبینا محمد ﷺ و خاتم الانبیاء، لیس إلاشبه قطیرة في محیطات فضائله، و لقد تعطر مقالي هذا بسیرته العطرة الفواحة۔

ما إن مدحت محمدا بمقالتي　　و لكن مدحت مقالتي بمحمد
و ما أشبه كلامي هذا بالياقوت　　ولقد كان من قبل حجرا
محمد بشر و ليس كالبشر　　و هو ياقوت و الناس كالحجر

Junaid Jamshed

Our Beloved

I write over this great personality and my eyes are constantly shedding tears, and after every little while when I remember that we have lost our beloved, who used to grasp us with his beautiful, emotional and painful voice, I get frozen and become unable to write any more.

And there I go many years back and remember the time when he was a singer and I used to be his big fan. I used to follow him and always wait for his voice to strike my ear with a new melody and new lyrics; but in fact, I had placed a poster of Junaid in my room, in which he is holding a guitar and singing for Pepsi. He was from that time onwards a role model for the youth, and his voice used to represent patriotism and his love of spreading peace and kindness amongst mankind.

And then suddenly, I see that he just got disappeared from the media. We no longer hear him, and nor do we listen about him. Then fortunately on a blessed day, while I was sitting beside my elder cousin in his car, he turns on a Naat. I ponder over the voice, and say to myself; this voice sounds familiar to Junaid Jamshed's, then I pick up the album, and what do I see? Oh my goodness! Junaid Jamshed! Is this really him? He has a beard according to Sunnah and is wearing a Sunnah outfit. I could not believe my eyes, and nor my ears. Then I ask my cousin: "is this Junaid Jamshed, the singer?" He happily answers: "Yes, it is him.", and then he goes on telling me about his story and how he changed, after joining the great work of *Dawah* and *Tableegh*, and left singing and started a Halal business, and then eventually started reciting Islamic Anasheed. All of this was easy to hear, but like impossible for me to believe. After this incident, I started thinking about him. What has happened to the old Junaid? Why did he leave his old life? He used to

be our role model because he gathered money, fame and everything through his beautiful voice, and now he leaves all of it! Why? Why does he do so? And why did he start living his new life as a preacher of Islam? These questions kept circling in my mind for years, like extremely difficult puzzles that are hardly solved. And as time passed by, I got to know that I was not the only one with these questions, but many more besides me had questions similar to mine, and I won't be exaggerating if I say that Junaid's turnover was a cause of changing thousands of lives worldwide. These questions of mine laid me on the path of finding the truth behind this world and this life, and I only reached the answers to my questions after I changed myself. And only then did I feel the sweetness of Eeman and got to know what darkness do sins carry with them. So how thankful shall I be for Junaid, who laid me on the path of truth?

Another thing which I would like to share about Junaid is what I heard from Maulana Tariq Jamil

Sahab (D.B.) in his Jumuah's Bayan, which he delivered in Masjid Baitussalam. He said that I have never seen such a Janazah (funeral) in my life. And verily, big and honoured funerals are a sign of success and victory in the Hereafter. And Junaid's funeral had thousands of people behind him, many of whom were crying as if they had lost their son or brother. He received protocol from the Army, the Navy, the Air force, and hence, from every exclusive and non-exclusive person. Continuing his words, he said that he sat at Junaid's house after burying him with Junaid's friends and family, and they discussed his astonishing funeral and tried to figure out the reason behind his great success, which many Mashaikh as well did not receive in their funerals. They agreed that it wasn't because of abundant Tilawah, and nor because of abundant Zikr, but the reason behind it was his good nature and loving character. He would always be happy and meet people with a smile. He did not get resentful and never became angry with anyone.

Junaid's life remains an example for us, he showed how it is possible to change your life and leave bad deeds. You may face some obstacles for a time, but after that, there will be nothing for you but success in this world and the Hereafter. The more you sacrifice for Allah, the better He will Grant you. And we also get to know from his sudden death that, like Junaid, we all have to leave this world, and everyone and everything in it, so we must always be prepared to die and meet Allah, in a way we desire to meet him, because we die as we live, and we will be raised, as we die.

''Oh! Our beloved and fortunate Junaid! Oh, the one whose life and death remain an example for us! We can never find someone like you, who lived a happy life, found Allah, changed millions, and then met Allah as a martyr of his way.'' May Allah make us follow his way in good deeds and character, and give us a life like his, and death like his, in His way, striving for His Deen, to see it spread all over the world. Aameen.

Oh, Abdullah!
Be Allah's!

Oh Abdullah

Over the mountains below the sea
He is the Creator of all you see
And the unseen is His creation too
Beyond everything He Lives with you
Do not disregard what you see
Unbelievable is what you feel
Let go of pain, just leave your past
Live the life with another chance
Agree to have no need to fight
Have nothing to say or do in fright
Forgiveness is your life's joB
Kindness is your style of lifE
And Goodness upon evil is your life's formulA
To make your Nafs SmalL
Do Zikr and Dua for alL
For Being Allah's KhalifA
Keep on Nafs your watcH
Companionship of the Sadiqee'
Shall guide you to your spiritual needS

Be Allah's!

یادداشت

کتاب اہلِ نظر کی نظر میں

پیرِ طریقت حضرت جی شیخ المشائخ شمس العارفین مولانا شمس الرحمن عباسی دامت برکاتہم العالیہ

امام و خطیب: جامع مسجد غفوری

جانشین خانقاہِ غفوریہ حقانیہ نقشبندیہ سلسلۂ عالیہ نقشبندیہ مجددیہ غفوریہ حقانیہ

شاگردِ خاص حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ

بندے نے اپنے محبوب مرید اور خاص تعلق رکھنے والے اور دِین کے لیے بڑی قربانی اور لمبا سفر طے کرنے والے پیارے بیٹے محمد سعد رفیق گاڈت کا پُرذوق اور پُرشوق مضامین کا مجموعہ ''کلیاں'' از اول تا آخر مطالعہ کیا اور شروع کرتے ہی اس میں ایسا مستغرق ہوا کہ جب تک ختم نہیں کیا، نہیں چھوڑا۔

بہت باذوق اور علم و عمل اور محنت و مطالعے کا شوق پیدا کرنے والا مفید رسالہ پایا۔ دل و دماغ کو سکون دینے والا، ہمت بڑھانے والا پایا۔

اللہ پاک ان کی اس محنت کو قبول فرمائیں اور قارئین کے لیے علم و عمل میں بڑھنے کا ذریعہ بنائے اور اِسے ان کے اور ہمارے لیے صدقۂ جاریہ بنائے اور اپنے دربارِ عالیہ میں مقبول بنائے۔ آمین

اُستاذ الاساتذہ حضرت مولانا مفتی محمد یاسین صاحب دامت برکاتہم العالیہ

(استاذ جامعۃ العلوم الاسلامیۃ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی)

ومہتمم و رئیس جامعہ ارشاد العلوم یوسفیہ کھتری مسجد کراچی

کرونا وائرس کے ایام میں جب نظامِ زندگی پوری دنیا میں معطل ہو کر رہ گیا تھا، حتی کہ حرمین شریفین میں حج و عمرہ اور روضہ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حاضری پر، مساجد میں نمازوں اور تعلیم گاہوں میں تعلیم پر پابندیاں لگ گئیں، بہت سے لوگوں نے فراغت کے ان لمحات کو خوابِ غفلت میں گنوایا، جب کہ سعادت مند اور خوش قسمت لوگوں نے زندگی کے ان اوقات کو حدیث رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی روشنی میں غنیمت جانا اور کارآمد بنایا۔ برادر محترم مولانا مفتی سعد رفیق زید مجدہ، فاضل و متخصص جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن، ان خوش قسمت لوگوں میں سے ہیں جنھوں نے وقت کے ان لمحات کو قیمتی بنایا، متفرق مگر پُراثر مضامین جمع کیے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالی ان مضامین کو بھی شرفِ قبولیت عطا فرمائے اور ہر خاص و عام کے لیے کارآمد و مفید بنائے۔



محمد سعد رفیق گاڈت

SKYRISE

IlmoAmal